کلیاتِ سخن

اصغر مہدی نظمی

مرتب

سید سجاد مہدی

حرفِ تفخر و توقیر

مجھے اپنے والدِ گرامی مرحوم اصغر مہدی نظمی کی شاعرانہ عظمت پر اپنے تفخر و توقیر کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے دلی طمانیت محسوس ہو رہی ہے اُن کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ اور اظہار اُن کے اِس "کلیاتِ سخن" سے بھرپور طور پر ہوتا ہے۔ اِس "کلیاتِ سخن" کی اشاعت پذیری والدِ گرامی کے دیرینہ دوست جناب مسلم شمیمؔ کی تحریک پر میرے بڑے بھائی سید وقار مہدی کی سعیِ مشکور کا نتیجہ ہے جنھوں نے اِس "کلیاتِ سخن" کی اشاعت میں کلیدی کردار ادا کر کے پورے خانوادے کا سر بلند کر دیا ہے۔ میرے مذکورہ بڑے بھائی اپنے والدِ گرامی کے قابلِ فخر وارث ہیں ، اور مجھے اُن کے بڑے آدمی ہونے کا بھی احساس اور تفخر ہے۔ میں اُن کے لیے بہتر سے بہتر منصب پر فائز ہونے کے لیے دعا گو ہوں۔ زیرِ نظر "کلیاتِ سخن" کا شائع ہونا ان شاء اللہ! اُن کی شخصیت کو وسیع تر بنانے کا موجب ہوگا۔

_______ سید افتخار مہدی

کلیاتِ سخن

کلیاتِ سخن

اصغر مہدی نظمی

مرتب

سید سجاد مہدی

نقش

NAQSH

نامِ کتاب	:	کلیاتِ سخن
شاعر	:	اصغر مہدی نظمی
مرتب	:	سید سجاد مہدی
مصوریِ سرورق	:	نقش پبلیکیشنز
مشینی کتابت	:	ایضاً
طابع	:	خرم پرنٹنگ پریس، کراچی
سالِ اشاعت	:	۲۰۲۰ء
تعدادِ اشاعت	:	پانچ سو
قیمت	:	۵۰۰ روپے
ملنے کے پتے	:	ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی
		مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی
		تھامس اینڈ تھامس، ریگل چوک، صدر، کراچی
		توکل اکیڈمی، اردو بازار، کراچی

NAQSH

نقش پبلیکیشنز

۵۰۵، فیز ۲، مدینہ پلازا، بالمقابل ماما پارسی سکول، نزد سعید منزل

ام۔اے۔ جناح روڈ، کراچی۔ ۰۲۰۷۲۰۲-۱۳۳۰

naqshpublications@yahoo.com

انتساب

صاحبِ "کلیاتِ سخن" مرحوم اصغر مہدی نظمی کے
مرحوم چھوٹے بھائی معروف شاعر

ساغر مہدی کے نام



میرے پیارے بھائی اور "دیوانجلی" کے شاعر
ساغر مہدی (مرحوم) اِس مجموعے کو مرتب کر رہے تھے
مگر اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب ۱۹۸۰ء
میں ۴۴ سال کی عمر میں بھارت میں انتقال کر گئے۔ یہ
مجموعہ اُن کی خواہش کی تکمیل ہے ـــــ اصغر مہدی نظمی

مہرِ خروج

حیف ! در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

نام:	اصغر مہدی زیدی
قلمی نام:	اصغر مہدی نظمی
والد کا نام:	سید خورشید حُسین زیدی، وکیل بہرائچ (یوپی، بھارت)
والدہ کا نام:	سیدہ رقیہ بیگم
سنہِ ولادت:	۱۹۳۲ء، بہرائچ (یوپی، بھارت)
سکونت قبلِ ہجرت:	لکھنؤ (بھارت)

اِس حوالے سے اُن کی ایک غزل کا مقطع:

لکھنؤ سے جو عبارت ہیں ، وہ لمحے ، نظمی!
اب کسی شہر کو اپنا نہیں ہونے دیں گے

آبائی وطن: سادات باہرہ، مظفرنگر

تعلیم: بی۔کام

شعری تخلیقات: پہلا مجموعۂ کلام 'خواب ترے خیال کے'، مطبوعہ ۱۹۸۲ء

دوسرا مجموعۂ کلام 'موج موج تشنگی'، مطبوعہ ۱۹۹۴ء

انتقال: ۱۵/اگست ۱۹۹۴ء، بروزِ دوشنبہ

انتقال کے وقت عمر: تقریباً ۶۲ سال

اولادیں: سید وقار مہدی، سید افتخار مہدی، سید خورشید مہدی اور سیدہ شہلا زیدی

وجہِ انتقال: بعارضۂ تنفس

اِس پس منظر میں آخری دنوں میں کہی جانے والی چند غزلوں میں سے خاص کیفیت کا حامل ایک شعر:

یہی بہتر ہے کہ خود اپنی مسیحائی کر
یہ معالج تجھے اچھا نہیں ہونے دیں گے

مرتبہ: حسین انجم

کلیاتِ سخن

مستحضرات

ابتدائیات

مجموعۂ کلام 'خواب ترے خیال کے'

غزلیات:

منظومات:

رباعیات:

مجموعۂ کلام ”موج موج تشنگی“

غزلیات:

منظومات:

مجموعۂ کلام "صلیبِ درد"

غزلیات:

منظومات:

قطعات و رباعیات:

مسلم شمیم

حرفِ تعارف

''کلیاتِ سخن'' میرے عزیز مرحوم دوست اصغر مہدی نظمی کی شاعری کا کلیات ہے جس میں اُن کے تین شعری مجموعوں کی تمام تر نگارشات شامل ہیں، علاوہ بریں دو مجموعوں میں اُن کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اربابِ نقد و نظر کی تحریریں بھی بلا کسی ترمیم و تحریف کے اِس کلیات میں شامل کی گئی ہیں تاکہ قارئین کو اُن کے سفرِ شعرگوئی کا بھرپور ادراک ہو سکے اور اِس باب میں تفہیم کے لیے اربابِ فکر و فن کی آرا کی رہ نمائی حاصل رہے۔ مذکورہ دو مجموعوں میں سے ایک مجموعہ 'خواب ترے خیال کے' اُن کی زندگی میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مجموعہ 'موج موج تشنگی' جبرِ حالات کے زیرِ اثر اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا۔ اِس کا شدید ملال مجموعے کے ناشر معروف و معتبر شاعر اور ماہ نامہ 'طلوعِ افکار' کے مدیرِ اعلیٰ مرحوم حُسین انجم کو تھا جس کا اظہار اُنھوں نے مجموعے کے ابتدائی صفحے میں یہ لکھ کر کیا کہ اصغر مہدی نظمی کو اِس مجموعے کو چھپا ہوا دیکھنے کی بڑی

تمنا تھی، لیکن افسوس کہ ادارے کی ممکنہ کوششوں کے باوجود کراچی کی سیاسی بے چین فضا، شدید بارشوں، بجلی کے بار بار انقطاع کی بنا پر تاخیر ہوئی اور یہ مجموعہ اُن کی زندگی میں شائع نہ ہوسکا:

شرمندہ ام ازاں کہ بایں ابتلائے دہر
فرصت نشد کہ خدمتِ ایں آستاں کنم

بعدِ ازاں مرحوم حُسین انجؔم نے ماہ نامہ 'طلوعِ افکار' کراچی کا خصوصی شمارہ شائع کیا جس کے سرورق پر اُن کی تصویر شائع کی گئی تھی۔ یہ خصوصی شمارہ مرحوم حُسین انجؔم کی ادبی بلند قامتی اور اعلیٰ ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ اظہارِ اِس حقیقت کے پیشِ نظر کیا گیا ہے کہ خود مرحوم حُسین انجؔم اب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور دبستانِ کراچی اُن کی عدمِ موجودگی کو نظرانداز نہیں کرتا۔

مذکورہ بالا دو شعری مجموعوں کے علاوہ ایک نیا غیر مطبوعہ مجموعہ بھی اِس ''کلیاتِ سخن'' کا حصہ ہے۔ یہ تیسرا مجموعہ 'صلیبِ درد' کے نام سے موسوم ہے۔ اِس مجموعے میں بھی اُن کا کلامِ بلاغت نظّام اپنے پورے معیاراتِ فن اور محاسنِ سخن کا حامل ہے۔ اِس مجموعے میں مذکورہ دونوں مجموعوں کی طرح مختلف اصنافِ سخن کی تخلیقات شامل ہیں جن میں غالب حصہ غزلیات کا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ وقیع اور معنویت کی حامل ٹھہرتی ہے کہ مرحوم اصغر مہدی نظمؔی کو صنفِ غزل سے خاص شغف تھا، اور اُن کی شاعرانہ خصوصیات اور محاسن کا جائزہ لیتے وقت اُن کی غزلیات کو خصوصی مقام حاصل ہونا چاہیے۔

مرحوم اصغر مہدی نظمؔی کے شاعرانہ مقام و منصب کے حوالے سے آخرالذکر مجموعے 'موج موج تشنگی' میں میرا مضمون 'سلیقۂ عرضِ ہنر کا شاعر' کے عنوان سے شامل

ہے، لہٰذا اُن کی شعری خصوصیات اور محاسن کا یہاں بیان کرنا میرے نزدیک کسی معنویت کا حامل نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ بات کو دُہرانے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ مختصراً اُن کے شاعرانہ کمالات کا اِسی قدر بیان ہوسکتا ہے، اس لیے کہ تیسرے مجموعے 'صلیبِ درد' میں اُن کے تخلیقی سفرِ ارتقا کا واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اور یہ تیسرا مجموعہ زیرِ نظر "کلیاتِ سخن" کا وقیع حصہ ہونے کے معیارات پر پورا اترتا ہے۔

مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ سے میری شناسائی ۱۹۶۰ء کی دہائی کے ابتدائی حصے سے ہے جب وہ میرے سسر مرحوم قبلہ سید محمد لئیق کے رفیقِ کار کی حیثیت سے برسرِ کار تھے اور اُن کا دفتر ہائی کورٹ کے نواح میں واقع صوبائی حکومت کا سکرٹیریٹ تھا۔ اُن سے میرا تعارف میرے مذکورہ محترم سسر نے بحیثیت نوجوان شاعر کے کرایا تھا، جب سے اُن سے رہ و رسم اور شناسائی قائم ہوئی اور یہ شناسائی آشنائی میں اُس دوران تبدیل ہوئی جب مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری کے دوسرے مجموعے 'موج موج تشنگی' کے ناشر مرحوم حسین انجم کے واسطے سے ربط و ارتباط فزوں تر ہوتا گیا۔ وہ ایک نہایت مخلص انسان تھے۔ میرا اُن کے ہاں جانا آنا وقفے وقفے سے ہوتا رہتا تھا۔ اُن کی قیام گاہ بفرزون، شمالی کراچی میں تھی جہاں شعر و ادب کی چھوٹی بڑی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں اور میں نے اُن میں شریک ہونا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ اُن کے دوسرے مجموعے 'موج موج تشنگی' کی اشاعت کے آخری مرحلوں میں مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ، جو ایک عرصے سے بیمار تھے، راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ اُن کا وسیع تر حلقۂ احباب اُن کے انتقال کے سانحے سے بے حد متاثر ہوا۔ اُن کا تعزیتی اجلاس میرے گھر پر منعقد ہوا جس میں خاصی بڑی تعداد میں شعرا اور ادبا شریک ہوئے اور اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اِس تعزیتی اجلاس کی روداد ماہ نامۂ 'طلوعِ افکار'

کے خصوصی شمارے میں شاملِ اشاعت ہوئی تھی۔ یہ شمارہ اُن کے انتقال کے بعد دسمبر و جنوری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا تھا۔ مجھے بڑی گہری طمانیت ہے کہ یہ "کلیاتِ سخن" میری خصوصی دلچسپی کے نتیجے میں پُرشکوہ انداز سے شائع ہو رہا ہے۔ اِس باب میں اُن کے لائق و فائق صاحب زادے سید وقار مہدی کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے والدِ گرامی مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کے اقدار و روایات کی پاس داری کے ساتھ اُن کی نظریاتی زندگی جو اُن کی شعری تخلیقات میں نمایاں عنصر کے طور پر عیاں ہے اُس کی بامعنی پیروی کو اُنھوں نے اپنی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں اور جد و جہد کا منشور اور لائحۂ عمل قرار دیا۔ وہ ایک ایسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہیں جس کا عوام دوست منشور جبر و جہل اور استحصال و عدمِ مساوات کے خلاف تحریک کے طور پر ابھرا اور ملک کی قومی سیاست میں عوام کی وسیع تر وابستگی کے امکانات روشن ہوئے۔ عوام اور انسان کے دُکھ کی کہانی مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری میں روحِ رواں کا درجہ رکھتی ہے۔ سید وقار مہدی کی جد و جہد سے عبارت زندگی اپنے والدِ گرامی کی فکری دنیا سے مستعار کہی جا سکتی ہے۔ اُن کے لیے خوب سے خوب تر مراحل اور مناصب کے لیے میری نیک تمنائیں دلی دعاؤں کا درجہ رکھتی ہیں۔

سید وقار مہدی

گنجِ گراں مایہ

مرحوم والدِ گرامی اصغر مہدی نظمی کے ''کلیاتِ سخن'' کی اشاعت اور پیش کش میرے لیے باعثِ فخر بھی ہے اور باعثِ مسرت بھی۔ اِس ''کلیاتِ سخن'' کی اشاعت پذیری کے محرکِ اول اور کلیدی کردار کے حامل والدِ مرحوم کے دیرینہ دوست جناب مسلم شمیم ہیں جن کی توجہِ خصوصی اور عملی دلچسپی کے نتیجے میں یہ ''کلیاتِ سخن''، جو میری نظر میں گنجِ گراں مایہ کا حامل ہے، مجھے یقین ہے کہ ادبی حلقے میں بھرپور پذیرائی حاصل کرے گا۔ اِس کی وجہ اُن کی شخصیت اور فن کی گراں مایگی ہے۔ میں ایک غیر ادبی آدمی ہوں، مگر میں نے اُن کی شعر و ادب سے والہانہ وابستگی دیکھی ہے۔ اُن کے احباب میں اُن کے لیے عزت و تکریم اور مقبولیت اُن کے خانوادے کے ہر فرد کے علم میں ہے۔ شہر کے ادبی اجلاسوں میں اُن کی شرکت خال خال ہوتی تھی مگر جب بھی کبھی کسی محفلِ شعر و سخن میں گئے تو ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ خود اُنھیں ادبی

محفلوں سے جو لگاؤ تھا، اُس کا اظہار وہ اپنے گھر میں یہ محفلیں منعقد کر کے کرتے رہتے تھے۔ ایسی محفلوں کا انعقاد وہ اپنے آبائی وطن جانے پر بھی کیا کرتے تھے میں اپنی ملازمت اور دیگر سرگرمیوں کے باوجود والدِ گرامی کی ادبی زندگی اور شاعرانہ شخصیت کی قدر و منزلت سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ ایک اعلیٰ ظرف انسان تھے اور اپنے خانوادے کے ہر فرد کے لیے سراپا شفقت و محبت تھے۔ سب کی تعلیم و تربیت کی طرف اُن کی بھرپور توجہ رہی تھی۔ ہر فرد کو اپنے آبا و اجداد کے تہذیبی و ثقافتی ورثے سے اُنھوں نے نہ صرف آگاہ رکھا بلکہ اپنی نئی نسل میں اُسے منتقل بھی کیا۔ یہ اُنھی کی تربیت کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے مراحلِ ترقی طے کیے اور اپنے لیے اور اپنے خانوادے کے لیے سیاسی اور سماجی امور اور دیگر شعبوں میں عزت و توقیر حاصل کی۔ یہ اُنھی کی تربیت اور دعاؤں کا فیض ہے کہ میں حکومتِ سندھ میں ایک معتبر اور اہم شعبے کے سربراہ کی حیثیت سے فائز ہوں اور پاکستان کی مقبول ترین سیاسی عوامی جماعت یعنی 'پاکستان پیپلز پارٹی' سے وابستگی کا عرصہ میرے عرصۂ حیات کے ایک وسیع دورانیے کا حصہ ہے۔ میرے والدِ گرامی بھی بانی کارکن کی حیثیت سے اِس جماعت سے وابستہ تھے، اور ہماری اِس وابستگی کا عرصہ نصف صدی پر محیط ہے مذکورہ جماعت اپنے نظریات کے حوالے سے ترقی پسند جماعت ہے اور عوام اور جمہور کے مفادات کے لیے سرگرداں ہے۔ اِس جماعت کے بانی قائدِ عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو اور محترمہ شہید بےنظیر بھٹو پاکستان کی تاریخ کے روشن ترین ابواب ہیں۔ اِس حوالے سے میں مذکورہ جماعت سے وابستگی کو اپنی خوش بختی اور اپنی زندگی اور جد و جہد کا حاصل سمجھتا ہوں۔ والدِ گرامی کی ترقی پسند اکابرِ ادب سے عقیدت اور وابستگی سے سب لوگ واقف ہیں۔ اُنھوں نے اپنے شعری مجموعے 'خواب ترے

خیال کے' کا انتساب ملک کے نام ور ترقی پسند ناول نگار اور ادیب و دانش ور جناب شوکت صدیقی کے نام کیا تھا جو اُن کی ادبی نظریات سے وابستگی کا گویا غیر مبہم اعلان تھا۔ میری سیاسی زندگی بھی اُن نظریات سے متاثر ہے جو میرے والدِ گرامی کی شعری تخلیقات میں غمِ زمانہ اور غمِ انساں کے زمرے میں بیان ہوئے ہیں جن کے حوالے سے متعدد اہل الرائے نے اظہار کیا ہے۔ غرض یہ کہ یہ "کلیاتِ سخن" میرے والدِ گرامی کی ادبی زندگی کا سرمایۂ عظیم ہے جس کو ادبی حلقوں تک شائع کر کے پیش کرنے کی سعادت مجھے حاصل ہوئی ہے، جسے میں اپنے خانوادے کے لیے ایک قابلِ فخر ورثہ سمجھتا ہوں۔

میں بارِ دیگر جناب مسلم شمیم کی خصوصی توجہ اور عملی اظہار پر اُن کا شکرگزار ہونا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہوں۔ سپاس گزاری کے اِس مرحلے پر میں اُن کے معاونِ خصوصی اور اِس "کلیاتِ سخن" کے ناشر جناب اکبر خان کیانی کا اُن کی اعلیٰ معیارِ طباعت و اشاعت کی کارگزاریوں پر شکریہ ادا کرنا بھی اپنا خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ میرے والدِ گرامی کے اِس "کلیاتِ سخن" کو اربابِ علم و دانش خاطر خواہ خیر مقدم و پذیرائی سے نوازیں گے۔

سید سجاد مہدی

عرضِ مرتب

'کلیاتِ سخن' میرے جدِ امجد مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کا مکمل مجموعہ کلام ہے جو اُن کے تین شعری مجموعوں پر مشتمل ہے۔ دو مجموعوں کی گویا بارِ دیگر اشاعت پذیری ہے، یعنی 'خواب ترے خیال کے' اور 'موج موج تشنگی'۔ مجموعہ کلام 'خواب ترے خیال کے' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس مجموعے کی ترتیب و تدوین کرنے والی چار اہم ادبی شخصیات تھیں، یعنی وسیمؔ فاضلی، اسحاق اطہر صدیقی، نیازؔ بدایونی اور ایوب پیامؔ۔ یہ چاروں حضرات میرے جدِ امجد کے اُن دوستوں میں سے تھے جو اِن کی شاعرانہ زندگی کے ساتھی، رفیق اور جلیس تھے۔ اِن دوستوں کی دلچسپی اور تحریک اِس مجموعے کی اشاعت پذیری کا باعث بنی تھی۔ اِس مجموعے کے حوالے سے ایک صفحے کا تعارفی اظہار مرحوم شبنمؔ رومانی کا ہے۔ یہ مختصر تحریر میرے جدِ امجد کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے بیک وقت خوب صورت بیانیہ ہے۔ مرحوم شبنمؔ رومانی فرما گئے:

"کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بلیغ ہوتی ہے۔ مہدی نظمیؔ کم آمیز، کم سخن اور کم گو ہیں۔ وہ کیمرے کے نہیں، کمرے کے شاعر ہیں۔ اُن کے جوہر خصوصی نشستوں میں زیادہ کھلتے ہیں جہاں مجمعِ اہلِ نظر ہوتا ہے مہدی نظمیؔ عام مشاعروں میں عموماً نہیں جاتے، جاتے ہیں تو شعر نہیں سناتے۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو شہرت سے خوف کھاتے ہیں اور چھپنے سے زیادہ چھُپنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

غزل مہدی نظمیؔ کا خاص میدان ہے، مگر وہ غزل میں ذات کے دُکھ کم اور اجتماعی المیے زیادہ لکھتے ہیں۔ اُن کے ذاتی دُکھ بھی اجتماعی دُکھوں میں گھلے ملے نظر آتے ہیں"۔

مرحوم شبنمؔ رومانی کا یہ مختصر اظہاریہ میرے جدِ امجد کی شخصیت اور شاعری کی جامعیت کی حامل عکاسی ہے۔

اِس مجموعے کا پیش لفظ برِ صغیر کے عظیم ادیب و ناقد پروفیسر مجتبیٰ حُسین نے لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ یہ نو صفحات پر مشتمل پیش لفظ جہاں میرے جدِ امجد مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کی شخصیت اور شاعری پر جامع اظہاریہ ہے، وہیں خود ایک ادبی شہ پارہ بھی ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حُسین مرحوم کا یہ پیش لفظ مذکورہ مجموعے کی عزت و توقیر میں اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ پیش لفظ زیرِ نظر 'کلیاتِ سخن' کا حصہ ہے جس سے قارئین بہرہ مند ہوں گے، مگر یہاں میرے جدِ امجد کی مجموعی شاعرانہ جہات کا خوب صورت بیان ایک اقتباس ہے جو یہاں ایک ادبی ریفرنس کے طور پر پیش کرنا معنویت سے خالی نہیں ہے:

"نظمیؔ صاحب واقعی اچھے شاعر ہیں، سلیقے سے شعر کہتے ہیں صاف کہتے ہیں، مشکل بنا کر اپنے کو منوانے یا پہچنوانے کی کوشش

نہیں کرتے۔ اُن کی شاعری بے خبر آدمی کی شاعری نہیں ہے۔ نظمیؔ صاحب راہ کے پیچ و خم اور دشواریوں سے واقف ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حالات بدلتے ہیں اور حالات بدلیں گے۔ جدید ہونے کے چکر میں وہ شعریت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ اُن کی شاعری ہجر کی شاعری ہے۔ اُس میں یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ مستقبل سے مایوس نہیں ہے، حال سے دُکھی ہے اسی لیے اِس کا درد بے سود نہیں ہے"۔

میرے جدِ امجد نے یہ مجموعہ اپنے بزرگ دوست شوکت صدیقی کے نام معنون کر کے اپنے فکری اور نظریاتی حوالوں کا اعادہ کیا ہے، یعنی ترقی پسند مکتبۂ فکر و خیال سے اپنی وابستگی کا ببانگِ دہل اعلان۔ 'حرفِ تکمیل' کے زیرِ عنوان میرے دادا مرحوم نے اپنے مرحوم بھائی یعنی میرے چھوٹے دادا اور ہندوستان کے مشہور شاعر ساغرؔ مہدی کے سانحۂ ارتحال کا پُراثر الفاظ اور پُردرد انداز میں اظہار کیا ہے۔ اِس 'حرفِ تکمیل' میں میرے مرحوم دادا نے جو کچھ تحریر کیا ہے، اُس کی روشنی میں اِس "کلیاتِ سخن" کا انتساب میرے چھوٹے دادا مرحوم ساغرؔ مہدی کے نام کیا گیا ہے۔

اِس "کلیاتِ سخن" میں شامل میرے مرحوم دادا کا دوسرا مجموعۂ کلام 'موج موج تشنگی' ہے جو اُن کے انتقال کے کچھ عرصے بعد جبرِ حالات کے تحت شائع ہوا تھا۔ اِس جبرِ حالات کا بیان جناب مسلم شمیمؔ نے اپنے "حرفِ تعارف" میں کیا ہے۔ مجموعۂ مذکور میں خود صاحبِ کتاب کی مختصر تحریر بعنوان 'حرفے چند' کے علاوہ متعدد صاحبانِ فکر و نظر کی تحریریں شامل ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا، مرحوم حسینؔ انجم، سید مظہر جمیل، علی حیدر ملک احمد صغیر صدیقی اور جناب مسلم شمیمؔ کی وقیع تحریریں میرے مرحوم دادا کی شاعرانہ

جہات کے حوالے سے اعتراف کمال کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ سبھی جامعیت اور ادبی معیاراتِ نقد ونظر کی حامل تحریریں اِس ''کلیاتِ سخن'' میں شامل ہیں جن سے قارئین فیض یاب ہوں گے اور میرے مرحوم دادا کی شخصیت اور فن کا آئینہ اُن کے روبرہوگا زیرِ گفتگو مجموعہ بھی پہلے مجموعے 'خواب ترے خیال کے' کی طرح غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے، مگر غالب حصہ غزلوں کا ہے، یعنی غزل کی اولیت وافضلیت غالب عنصر کا درجہ رکھتی ہے۔

اِس ''کلیاتِ سخن'' میں شامل تیسرا مجموعہ 'صلیبِ درد' مختلف رسائل وجرائد میں مطبوعہ میرے جدِامجد کی چند غزلوں اور نظموں کے علاوہ زیادہ تر اُن کے غیر مطبوعہ کلام پر مبنی ہے۔ یہاں بھی نظموں کے مقابلے میں غزلوں کا حصہ حاوی ہے۔ ملحوظ رہے کہ اِس غیر مطبوعہ مجموعے کا نام میرے دادا مرحوم ہی کا مجوزہ ہے جس کا اظہار اُنھوں نے ۱۹۶۰ء کے عشرے میں اپنے چھوٹے بھائی ساغؔر مہدی کے نام لکھے گئے ایک خط میں کیا تھا۔

زیرِ نظر ''کلیاتِ سخن'' کا مجھے مرتب ہونے کا اعزاز حاصل ہے جسے میں اپنی خوش بختی جانتا ہوں۔ محترم مسلم شمیمؔ اور اِس ''کلیاتِ سخن'' کے ناشر جناب اکبر خان کیانی کی اِس باب میں عنایاتِ خسروانہ کے اظہار پر میں اِن دونوں حضرات کا صمیم قلب سے ممنون ومتشکر ہوں۔ اِس ''کلیاتِ سخن'' کی اشاعت پذیری کے محرک جناب مسلم شمیمؔ ہیں اور میرے والدِ گرامی جناب سید وقار مہدی کی عملی دلچسپی کے نتیجے میں یہ ''کلیاتِ سخن'' منصۂ شہود پر ظہور پذیر ہوا ہے۔ اِس ضمن میں اپنے چچا جناب سید خورشید مہدی کی غیر معمولی دلچسپی اور عملی کارکردگی کے اعتراف کو بھی میں ایک خوش گوار فریضے کی ادائیگی کے مترادف گردانتا ہوں۔ امید ہے کہ اِس ''کلیاتِ سخن'' کی میری اخلاص مندانہ ترتیبی کاوش کی سعیِ بلیغ میرے خانوادے سمیت اربابِ فکر ونظر میں بھی ضرور مشکور ہوگی۔

اکبر خان کیانی

گفتۂ ناشر

۳۵ سال تک اعلیٰ علمی و ادبی ذوق کی آبیاری کرنے والے ماہ نامہ جریدے 'طلوعِ افکار' کے بانی و مدیرِ مسؤل حسین انجؔم مرحوم اردو شاعری کی اعلیٰ ترین کلاسیکی روایات کے حامل تھے۔ وہ دبستانِ لکھنؤ کے چشم و چراغ ہی نہیں بلکہ سراپا لکھنؤ تھے اور لکھنؤ کی زبان پر درجۂ استناد رکھتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ طرز نثّار و نظم نگار بھی تھے۔ اُن کی حیثیت دنیائے شعر و ادب میں ایک نجمِ روشن کی تھی جن کے خرد افروز افکار کی تابانیوں سے منوّر حلقہ برداروں میں مجھ ناچیز کو بھی شمولیت کا تفخّر حاصل ہے اُن کی ذاتِ والاصفات سے بارہ سالہ فیضانِ درس و ہم نشینی اور پھر ناگہاں ارتحال کے واقعۂ فاجعہ کے بعد میرے لیے "آں قدح بشکست و آں ساقی نماند" کا معاملہ درپیش ہے۔ اصغر مہدی نظمؔی مرحوم کے نظامِ فکر و فن اور مزاجِ شعر و سخن کے باب میں کچھ گفتگو سے قبل حسین انجؔم مرحوم کا ذکرِ خیر کرنے کی علّت اِس یادگار واقعے

کا بالاختصار اظہار ہے کہ اصغر مہدی نظمیؔ مرحوم کے تین شعری مجموعوں بعنوان 'خواب ترے خیال کے'، 'موج موج تشنگی' اور 'صلیبِ درد' پر مبنی زیرِ نظر "کلیاتِ سخن" میں سے ایک مجموعہ 'موج موج تشنگی' حسین انجمؔ مرحوم کے اشاعتی ادارے 'جاوداں' کے تحت ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اُس زمانے میں راقم اُن کے ادارۂ مذکور میں نووارد تھا اور مذکورہ مجموعہ تکمیل کے اختتامی مراحل طے کر رہا تھا جن میں واجبی طور پر مجھ کو اپنی شرکت پر تا حال فخر ہے۔ اُس دور میں اصغر مہدی نظمیؔ مرحوم بے حد علیل تھے۔ وائے! حسرت کہ وہ اپنی کتاب کی مطبوعہ شکل دیکھنے سے قبل ہی راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ مجھ کو اُن جیسی ذاتِ متبحر کی خدمت میں شرفِ باریابی سے محرومی کا شدید قلق تا دمِ تحریر ہے:

آئے عشاق ، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر
(اقبالؔ)

آمدم برسرِ مطلب۔ شاعری الفاظ کی شعبدہ گری بھی ہے اور معنیٰ آفرینی بھی جس کے بتوسّل انسان اپنے انفس و آفاق کا اظہار کرتا ہے۔ شاعری کا مقصد محض تفریحِ طبع یا لذت اندوزی نہیں بلکہ معرفت اور ابلاغِ حق بھی ہے۔ کسی بھی شاعر کی قادرالکلامی و کمالِ شعری کا صحیح اندازہ فقط واردات و کیفیّاتِ قلبی کے باب میں کی گئی اُس کی راست گفتارانہ ترجمانی سے ہو سکتا ہے۔ حرف و صوت کے کھیل، یعنی شعبدہ گری کے تحت اِس نوع کی شاعری کو تحصیل و اکتساب یا محنت و ریاضت سے اپنے اختیار میں نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ توفیقِ ایزدی، سعادتِ وہبی اور گداختہ دلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اِس ذیل میں دقیق فلسفیانہ نکات یا نوع بنوع تشبیہات و استعارات

کے اختراعی عمل کی حیثیت بھی یکسر ثانوی ہے۔ جذباتِ نگاری شاعری کا انتہائی بنیادی جزو ہے جس سے سخن سنج کے مزاجِ شعری کی قطعی تعیین و تخصیص ہوتی ہے بقولِ غالبؔ:

حُسنِ فروغِ شمعِ سخن دوٗر ہے ، اسدؔ!
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

اصغر مہدی نظمیؔ مرحوم نے اعطاے ایزدی سے ایسا دردمند اور حسّاس دل پایا تھا جس پر غالبؔ صد رنگ ہی کے یہ دو شعر صادق آتے ہیں:

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ، ہمیں کیا کام!
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

☆

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دوٗد بھاگے ہے ، اسدؔ!
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ بہجت و مسرت کا اصل منبع و ماخذ غم کے مسلّمہ دوامی اثبات ہی سے کشیدہ ہے، کیونکہ:

آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمہ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
(اقبالؔ)

اپنی اِسی طبعِ غم آشنا کے زیرِ اثر شاعر نے اپنا موضوعِ سخن غزل کو قرار دیا ہے جو وارداتِ قلبیہ و امورِ ذہنیہ کے بیان کے لیے انتہائی موزوں صنف ہے۔ گو اُنھوں نے نظموں پر بھی طبع آزمائی کی ہے، لیکن اُن کے اِس ''کلیاتِ سخن'' میں مشمولہ سرمایۂ فکر و فن کا معتدبہ حصہ غزلوں ہی پر مبنی ہے جو اُن کی غالب مزاجی مناسبت و مراغبت کا

آئینہ دار ہے۔ زیرِ نظر "کلیاتِ سخن" میں شامل اُن کی تمام غزلیں طبع زاد اور زیادہ تر داخلیت یعنی غزل کے حقیقی موضوع سے عبارت ہیں۔

اصغر مہدی نظمی مرحوم کے مجموعی کلام کی بالاستیعاب خوانی سے منکشف ہوتا ہے کہ اُنھوں نے خیال کے لیے الفاظ اور الفاظ کے لیے تلازمے تلاش نہیں کیے بلکہ کسی کوشش کے بغیر پورے کا پورا شعر لفظ و معنیٰ کی مکمل اکائی کے ساتھ اُن پر خود بخود نازل ہوا ہے، کیونکہ شاعر نے اپنے اشعار میں معنیٰ آفرینی پیدا کرنے کے لیے مطالعے سے زیادہ مشاہدے اور معاملات سے زیادہ تجربات کی توانائی و وسعت سے کام لیتے ہوئے ذہنی تجربوں کو وجدانی تجربوں میں ڈھالا ہے اور اپنے کو جاں کاہی و کربِ روحانی کے مراحل سے گزارا ہے۔ اِسی معنیٰ آفرینی کے باعث اُن کی غزلوں کے سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی تاثیر اور تڑپ میں کہیں بھی جذبۂ خلوص کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ سرگرمِ حکایتِ غم رہتے ہوئے اُنھوں نے زباں پرستی اور لفظی بازی گری پر جذباتِ دروں کی صدق بیانی کو ترجیح دی ہے جو میری دانست میں وفورِ جذبات کا اقتضا بھی ہے۔ اُن کے ایک ایک شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے، درونِ خانہ میں برپا ہنگاموں سے مجبور ہو کے کہا ہے، ہر احساس اور واردات کو اُسی طرح لفظی صورت گری کے ساتھ پیکرِ شعر میں ڈھالا ہے جس طرح وہ دل پر گزری۔ گویا اُن کی سخن گوئی میں آمد کا عنصر آورد پر اِس قدر غالب ہے کہ لسانی اعتبار سے وہ اکبر الہ آبادی کی اِس رباعی کے مصداق ہو گئی ہے:

چھوڑ دہلی، لکھنؤ سے بھی نہ کچھ امید کر
نظم میں بھی وعظِ آزادی کی اب تائید کر
صاف ہے، روشن ہے اور ہے صاحبِ سوز و گداز
شاعری میں بس زبانِ شمع کی تقلید کر

حزنیہ داخلی کیفیات کی شدّت وحدت سے مغلوب کئی اشعار میں الم انگیز رجائیت کی موجیں بھی سرگرمِ عمل نظر آتی ہیں۔ خارجیت کے اعتبار سے غزل کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہو جانے کے باعث زندگی کے مصائب و آلام، ذہنی و روحانی تجربات اور زمانے کی ناہمواریوں پر مشتمل مضامین کو اصغر مہدی نظمیؔ مرحوم نے کمالِ خوبی اور بھرپور ابلاغ کے ساتھ اپنی غزلوں میں برتا ہے۔ غمِ جاناں اور کرب وجذبِ درونِ ذات کے حوالے سے اُن کے ہاں غزل کی اہم ترین خصوصیت یعنی ایمائیت واشاریت کے پہلو بہ پہلو روایت آمیز جدّت کی کارفرمائیاں بھی موجود ہیں۔ اِس خصوص میں بعض کیفیات کی ترجمانی میں اُنھوں نے ایسا پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے کہ غرض مندی میں بھی طبعِ خوددار ایک خاص شانِ پاسِ وضع کے ساتھ شریک وسہیم ملتی ہے اور لہجے میں بھی فطری متانت کا عنصر حاوی نظر آتا ہے۔ شعوری پختگی، گداختہ دلی اور سلیس لفظیات کی حامل جذبات نگاری اُن کی غزل گوئی کا اختصاص ہونے کے ساتھ اِس صنفِ حُسنِ جہاں آرا کے پاک بازانہ مزاج پر بھی دالّ ہے۔ من حیث المجموع اُن کی سخن وری کا محشرستانِ خیال اُن کے ذاتی جذبات و احساسات اور عمومی مشاہدات وتجرباتِ حیات کی رنگ آمیزی کا حسین مرقّع ہے۔

غزلیات کے دوش بدوش مختلف تجرباتِ زیست سے مرتسم، فکری رجحانات کی غمّاز اور اصغر مہدی نظمیؔ مرحوم کے مخصوص لب ولہجہ کی حامل نظمیہ تخلیقات بھی الفاظ کے خوب صورت دروبست کے ساتھ اِس ''کلیاتِ سخن'' میں زینت یاب ہیں۔

چونکہ ہر شخص اپنے وجدان کے مختلف جمالیاتی احساسات کے مطابق کسی کے کلام سے محظوظ ہوتا اور کوئی رائے قائم کرتا ہے، لہٰذا فی المثل درجہ بدرجہ منتخب اشعار کے تجزیہ وتحلیل سے قصدًا گریز کرتے ہوئے راقم اپنی اِس جملہ خامہ فرسائی کے ذیل میں فقط خیالات کے بالاجمال اظہار پر مکتفی ہوا ہے، بالتفصیل اظہار کے طور پر موصوف کا ''کلیاتِ سخن'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اصغر مہدی نظمی مرحوم کے فرزندِ ارجمند جناب سیّد وقار مہدی جس سعادت مندانہ سعیِ بلیغ کے تحت اپنے والدِ گرامی کے اِس "کلیاتِ سخن" کو مہتم بالشان انداز میں منصّۂ شہود پر لانے کے فریضۂ خوش گوار و کارِ افتخار کو بجا لائے ہیں، اُس میں بطورِ طابع و ناشر اُن کے ساتھ شرکت کو راقم السطور بھی مرحوم سے اخلاص مندانہ عقیدت کے پیشِ نظر اپنی خوش سعادتی پر محمول کرتا ہے۔

یہاں اِس مستحسن امر کا اظہار بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اِس "کلیاتِ سخن" کا بامِ طباعت و اشاعت پر آنا شاید ممکن نہ رہتا، اگر مدیرِ ماہ نامۂ 'طلوعِ افکار' حُسین انجم مرحوم کے رفیقِ خاص اور جریدۂ مذکور کے ادارتی امور میں موصوف کے دستِ راست مسلم شمیم صاحب اصغر مہدی نظمی مرحوم سے اپنے دیرینہ تعلقِ خاطر کے باوصف اُن کے سعادت مند فرزند جناب سیّد وقار مہدی کو اپنی حددرجہ بزرگانہ تشویق و تائید اور مخلصانہ تحریک و ترغیب نہ دلاتے۔

امیدِ واثق ہے کہ فکری صلابت، شعری متانت اور تخلیقی طراوت سے معمور اصغر مہدی نظمی مرحوم کا یہ دل پذیر "کلیاتِ سخن" اربابِ سخن شناس کے برگزیدہ و ثقہ ایوان میں سندِ قبولیت پائے گا۔

نازنین مہدی نظمی

حرفِ دعا و حرفِ تہنیت

میں اپنے مرحوم جیون ساتھی مشہور و معروف شاعر اصغر مہدی نظمی کے کلاموں کے مشترکہ مجموعے 'کلیاتِ سخن' کے شائع ہونے کے حوالے سے اپنی دلی طمانیت کے اظہار کے ساتھ اپنے مرحوم شریکِ حیات اصغر مہدی نظمی کے دیرینہ دوست جناب مسلم شمیم کی تحریک پر شائع ہونے والی اِس کتاب کی اشاعت کے حوالے سے اپنے بڑے بیٹے سید وقار مہدی کی خوش دلانہ دلچسپی اور عملی کارکردگی پر دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے مجھے روحانی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔

یہاں یہ اظہار کرنا بے معنی نہیں ہے کہ مجھے شعر و ادب سے گہرا شغف رہا ہے اور میں شعرگوئی کی شد بد سے بہرہ مند ہوں، چنانچہ مرحوم اصغر مہدی نظمی کے ساتھ میری ازدواجی زندگی میں شاعری قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے۔ اِس تناظر میں مذکورہ 'کلیاتِ سخن' کی اشاعت کے حوالے سے میری خوشیوں کی تفہیم ہونا چاہیے۔

خواب ترے خیال کے

خواب ترے خیال کے

(مجموعۂ کلام)

اصغر مہدی نظمی



سید احتشام حُسین

اصغر مہدی نظمیؔ کی غزل

آج کے شاعر نے غزل کے اندرونی حُسن کا راز پالیا ہے۔ وہ اُس پر زیادہ بوجھ ڈالے بغیر معمولی مشاطگی سے اُسے سجا کر حسین بنا دیتا ہے اصغر مہدی نظمیؔ نے بھی اِس اداشناسی کا ثبوت اپنی غزلوں میں دیا ہے کنایے اور استعارے کے ہلکے پھلکے زاویوں سے آراستہ کر کے اُس کی اداؤں کو اور دل نشیں بنا دیا ہے، اپنے جذبے کا گداز سونپ کر اُس میں گرمی اور خیالوں کی رعنائی بخش کر نکھار پیدا کر دیا ہے۔ نظمیؔ کی غزل میں درد کی جو ہلکی سی آنچ ہے، وہ میرے دل کو بھی چھوتی ہے کیونکہ وہ انسانی غم کے احساس سے معمور اور دردِ حیات کی کسک سے جان دار ہے۔

شبنم رومانی

اصغر مہدی نظمی

کچھ لوگوں کی خاموشی بھی بلیغ ہوتی ہے۔ مہدی نظمی کم آمیز، کم سخن اور کم گو ہیں وہ کیمرے کے نہیں، کمرے کے شاعر ہیں۔ اُن کے جوہر خصوصی نشستوں میں زیادہ کھلتے ہیں جہاں مجمعِ اہلِ نظر ہوتا ہے۔ مہدی نظمی عام مشاعروں میں عموماً نہیں جاتے جاتے ہیں تو شعر نہیں سناتے۔ یہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو شہرت سے خوف کھاتے ہیں اور چھپنے سے زیادہ چُھپنے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

غزل مہدی نظمی کا خاص میدان ہے، مگر وہ غزل میں ذات کے دُکھ کم اور اجتماعی الیمے زیادہ لکھتے ہیں۔ اُن کے ذاتی دُکھ بھی اجتماعی دُکھوں میں گھلے ملے نظر آتے ہیں اُن کی شاعری ایک ایسا ترقی پسندانہ رنگ و آہنگ لیے ہوئے ہے جو روایت سے مختلف ہونے کے باوجود اینٹی رومانٹک نہیں ہے:

لفظ لکھے ہیں میں نے بہت سوچ کر
میرا مکتوب ہے میری جاں کے لیے

اِس شعر میں کتنی بلاغت ہے! خط محبوب کو لکھا جاتا ہے، مگر یہ خطوط اپنے نفسِ ناطقہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ غزل کو خود کلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے، مگر یہ خود کلامی مجذوب کی بڑ نہیں ہے، بلکہ اِس کا ایک ایک لفظ سوچا سمجھا ہے، یہ حکایت نہیں شکایت ہے، یہ معاشی و معاشرتی ناانصافیوں اور سیاسی وسماجی ناہمواریوں کے خلاف ایک تخلیقی ردِ عمل ہے، ایک ایسا ردِ عمل جو مصنوعی اور روایتی نہیں بلکہ حقیقی اور خالصتاً عصری ہے:

سب نے باندھے ہیں مضامین قفس کے، یارو!
کیا گزرتی ہے تہِ دام، نہ جانے کوئی

پروفیسر مجتبیٰ حسین
(صدر شعبۂ اردو، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ)

پیش لفظ

فروری ۱۹۸۲ء کے پہلے ہفتے میں ایک دن، دن کون سا تھا یاد نہیں، اصغر مہدی نظمیؔ غریب خانے پر تشریف لائے۔ میں بیمار تھا۔ علیک سلیک، مزاج پرسی کے بعد نظمیؔ صاحب نے اپنے اشعار کی بیاض مجھے دی کہ میں اُس پر کچھ لکھ دوں۔ میں نے عذر کیا ٹالنا چاہا، بیماری کا حوالہ دیا، مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ چلے گئے۔ بیاض میرے سرہانے پڑی رہی۔ میں اپنی کم ہمتی اور اخلاق نما بداخلاقی پر خود کو لعنت ملامت کرتا رہا۔ میں واقعی کچھ لکھنا نہیں چاہتا تھا اور واقعی بیمار تھا۔ اِس کے علاوہ جب سے کراچی آیا تھا۔ مختلف کتابوں پر رائے دیتے دیتے طبیعت اوب چکی تھی۔

مجموعۂ کلام اور مجموعۂ آرا کی ایک ساتھ اشاعت جو کچھ بھی فوائد رکھتی ہو، مجھے یہ بہر صورت پسند نہیں ہے۔ شاعری کو کثرتِ التفات نہ زندہ رکھ سکتی ہے نہ قلتِ التفات مار سکتی ہے۔ اِس معاملے میں شاعر کو اگر اپنے پر اعتماد ہو تو غیر کو آزمانے کا مسئلہ مشکل

ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جیتنے کی خواہش کس میں نہیں ہے؟ مگر ہوس اور خواہش میں فرق ضروری ہے۔ اخباری مضامین کے ذریعے پبلسٹی، تقریبِ رونمائی پر تقاریر کا انتظام، پھر اُس کے بعد مختلف آرا کو سمیٹ کر کتابچے کی شکل میں چھپوا دینا، یہ ساری باتیں ہمارے ملک کی عجیب سی روایت بنتی جا رہی ہیں۔ شاید ہمارا ادب بھی اِسی سیاسی صورتِ حال سے گزر رہا ہے جس میں سارا ملک مبتلا ہے۔

سالِ گزشتہ بہت سے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اُن پر تبصروں اور تنقیدوں کے پُل باندھے جا چکے ہیں، مگر سال بھر بعد جب آپ اُس پُل سے اتر چکے ہوں گے تو آپ کے ہاتھ میں شاید ہی کوئی مجموعہ ہو۔ مشکل سے چند مجموعوں کے نام آپ کو یاد آئیں گے۔ اُن اشعار سے زیادہ اُن تقاریر کے تاثرات آپ کے ذہن میں محفوظ ہو سکتے ہیں جن میں آپ نے شرکت کی ہے یا جن ادبا اور شعرا کے حلقوں سے آپ تھوڑے بہت وابستہ رہے ہوں۔

ایسا کیوں ہے کہ عموماً ہمارے شعرا کی عمر چار پانچ سال ہوتی ہے (اُن کی طبعی عمر خدا دراز کرے!)؟ اُن کی شاعری میں خرام ہے مگر قیام نہیں ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ خراب شعر کہے جا رہے ہیں۔ ذہانت، لطافت اور جسارت سب کچھ اِن اشعار میں ملتا ہے، مگر پھر یہ کیوں ہوتا ہے کہ ایک مجموعے کے بعد دوسرا مجموعہ لانڈری میں بھیجنے کے قابل ہو جاتا ہے؟

ہمارے عہد کی تیز رفتاری اور اسٹاک ایکسچینج کے بھاؤ کے حوالوں سے شعری مجموعوں کی مقبولیت کو سمجھانا بڑی بے بسی کی بات ہے۔ اچھی شاعری اور اچھے شاعر کو رکنا چاہیے، خواہ اُس کے ساتھ حلقۂ یاراں ہو یا نہ ہو۔ اُس کا خطاب اخبار نویسوں تنقید نگاروں، تبصرہ شعاروں سے نہیں ہے، وہ اُن ادیبوں سے مخاطب ہے جو حافظ

سعدی، میر اور سودا کو زندہ رکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اِن تمام شعرا کا واسطہ تنقید نگاروں سے مرنے کے بعد ہی پڑا ہے۔ یہ آدمی ہر شہر، ہر قصبے، ہر گاؤں میں آپ کو مل جائیں گے ممکن ہے یہ زیادہ پڑھے لکھے نہ ہوں، ممکن ہے اِن میں بعض ڈاکٹر صاحبان سے بھی زیادہ پڑھے لکھے ہوں، لیکن ایک بات ایسی ملے گی جو مختلف حلقہ ہائے ادب میں ناپید ہے۔ اِن میں آپ کھوٹ نہیں پائیں گے۔ یہ اشعار کو تنقیدی اصطلاحات اور ذات و صفات کے حوالوں سے نہیں پڑھتے۔ اِن کو اشعار اس واسطے اچھے لگتے ہیں کہ اُن میں درد ہے، اجتماعی تجربہ ہے، کوئی لطف کی بات ہے، یادرہ جانے والی کیفیت ہے، کچھ صبحوں کے اجالے ہیں، کچھ شاموں کے دُھندلکے ہیں۔ زبان ایسی نہیں ہے کہ آدمی اپنے کو بے زبان محسوس کرنے لگے۔

نظمی صاحب پر لکھتے ہوئے یہ تمام باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُنھیں اپنے اشعار پر اعتماد کرنا چاہیے، نہ کہ میری یا کسی دوسرے کی رائے پر۔ حافظ نے کیا خوب کہا ہے:

شرحِ مجموعۂ گُل مرغِ سحر داند و بس
نہ کہ ہر کہہ ورقے خواند و معانی دانست

نظمی صاحب اپنی بیاض میرے سر پر پٹک کر چل دیے اور مجھے شدید کوفت میں مبتلا کر گئے۔ میں اُن پر کیوں لکھوں؟ میں اُنھیں جانتا بھی نہیں۔ میں نے اُن کے اشعار پڑھے، سنے، وہ کوئی معروف شاعر شاید نہیں ہیں۔ یا ممکن ہے، کسی زمانے میں رہے ہوں، اب بھلا دیے گئے ہوں۔ بہر صورت مجھے اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔

اُن کی بیاض پڑی رہی، یہاں تک کہ وہ دن قریب آنے لگا جس دن میں نے اخلاقی وعدہ کیا تھا کہ جو لکھ سکوں گا آپ کے حوالے کر دوں گا۔ میں نے آخرِ کار

بیاض کھولی۔ پہلی غزل نے اپنے کو پڑھوا دیا۔ آپ بھی چند شعر سنیے:

نہ تو ہجر کے نہ وصال کے ، نہ فسانے حُسن و جمال کے
مرے حرف حرف میں ہیں نہاں سبھی خواب تیرے خیال کے

میں رکوں کہ قصدِ سفر کروں ؟ تری آرزو سے حذر کروں؟
ترے پاس کتنے جواب ہیں مرے ایک سادہ سوال کے

وہی رنگ ہے ، وہی روپ ہے ، وہی سایہ ہے ، وہی دھوپ ہے
تو یہ چہرے چہرے پہ کیوں لکھے ہیں فسانے گردِ ملال کے؟

دوسری غزل میں چند شعر پسند آئے:

کوئی تو لائے گا دھوپ کے سائباں
اِس اندھیری گلی کے مکاں کے لیے

ذکرِ سود و زیاں کچھ ضروری نہیں
عہدِ رفتہ ! تری داستاں کے لیے

تیسری غزل مجھ سے چلی نہیں، چوتھی غزل کا ایک شعر پسند آیا:

سب نے باندھے ہیں مضامین قفس کے ، یارو!
کیا گزرتی ہے تہِ دام ، نہ جانے کوئی

پانچویں غزل میں پھر کئی شعر اچھے لگے:

اب مرا راستہ نہ دیکھنا تم
اب فقط گردِ کارواں ہوں میں

یاد آؤں تو یاد کر لینا
گزرے لمحوں کی داستاں ہوں میں

گل ہوئے جا رہے ہیں سارے چراغ
کن اندھیروں کے درمیاں ہوں میں؟

اِس کے بعد جو غزل آئی تو میں سناٹے میں رہ گیا۔ ایک لکیر تھی درد کی جو کبھی ٹوٹتی، کبھی جڑتی، کبھی جلتی، کبھی بجھتی، جسم و جاں پر کھنچتی چلی گئی:

یاد آتی رہی کس کس کی ادا راستے بھر
اور سنتے رہے پیاروں کی صدا راستے بھر

چھوڑ آئے تھے جسے دور، بہت دور کہیں
وہ مسلسل مرے ہم راہ رہا راستے بھر

پاؤں جس طرح کسی حلقۂ زنجیر میں ہوں
ہر قدم پر یہی محسوس ہوا راستے بھر

سر پٹکتے رہے صحرا میں بگولے کیا کیا
بین کرتی رہی کانوں میں ہوا راستے بھر

درد جس طرح چمک اٹھتا ہے لحظہ لحظہ
یُوں ہی تڑپا دِل اندوہ رُبا راستے بھر

ریزہ ریزہ ہوا آئینۂ حالات کے ساتھ
ہم نے باندھا تھا جو پیمانِ وفا راستے بھر

نظمیؔ صاحب۔ نے مجھے کچھ دے دیا، کچھ ایسی چیز دی جو آج کے بہت سے مقبول اور معروف شاعروں سے مجھے نہیں ملی۔ نظمیؔ صاحب کی غزل ختم کرنے بعد میں ایک دوسری فضا میں پہنچ گیا جہاں نہ نظمیؔ صاحب تھے نہ اُن کی غزل، جہاں صرف میں تھا اور میرا وہ ''میں'' تھا جواب میرا نہیں ہو پاتا۔ دھیرے دھیرے یہ فضا بھی ڈوب گئی اور پھر نظمیؔ صاحب کی غزل ابھری۔ غالبؔ نے سچ کہا ہے:

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

اِس غزل کے بعد میں نے نظمیؔ صاحب کو تمام وکمال پڑھا۔ اچھے شاعر ہیں:

گھر والے بےگھر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟
دل سارے پتھر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

سرو سمن کو لوٹنے والے آدھی رات کے چور
ایسے لوگ اَمَر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

ہم اک آدھ غزل کے شاعر ، لفظوں کے غم خوار
ہم ہی حرف بدر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

دیوار سرحدوں کی مرے راستے میں تھی
مجھ کو پکارتے رہے دل بستگی کے رنگ

☆

یہ احتیاط رہِ عشق میں ضروری تھی
کہ وہ قریب سے گزرا ، قریب آیا نہیں

☆

دل بہت چاہتا ہے ، گھر جائیں
یا اِسی دشت میں بکھر جائیں

ہم کھڑے ہیں عجب دوراہے پر
بول ، اے ہم سفر ! کدھر جائیں؟

درد احساس کے جگاتے رہو
ہجر کے زخم لاکھ بھر جائیں

☆

اب تو کچھ دور نہیں منزلِ اربابِ وفا
اب جنوں تیز ہے ، اب نقشِ قدم جاگے ہیں

شور گلیوں سے اٹھا اور گھروں تک پہنچا
در و دیوار بھی کہتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

☆

پھر در و بام گھر کے یاد آئے
پھر وہ ساماں سفر کے یاد آئے

ہم سے وفاشعار بھی کیسی نگہ بدل گئے!
کارِ ثواب کے لیے کارِ گنہ میں ڈھل گئے

☆

زادِ سفر ہے ایک یہی نقدِ جاں کہ ہم
رہ زن کو پوچھتے ہوئے منزل سے آئے ہیں

☆

دنیا کے دُکھ وسیلۂ اظہار بن گئے
جب سے مجھے سلیقۂ عرضِ ہنر ملا

نظمیؔ صاحب واقعی اچھے شاعر ہیں، سلیقے سے شعر کہتے ہیں، صاف کہتے ہیں مشکل بنا کر اپنے کو منوانے یا پہچنوانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اُن کی شاعری بے خبر آدمی کی شاعری نہیں ہے۔ نظمیؔ صاحب راہ کے پیچ وخم اور دشواریوں سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حالات بدلتے ہیں اور حالات بدلیں گے۔ جدید ہونے کے چکر میں وہ شعریت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے اُن کی شاعری ہجر کی شاعری ہے۔ اُس میں یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ مستقبل سے مایوس نہیں ہے، حال سے دُکھی ہے، اسی لیے اِس کا درد بے سود نہیں ہے۔ ایسی شاعری بے رس اور بے رنگ نہیں ہوتی۔ نظمیؔ صاحب کے یہاں یاد رہ جانے والی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کی غیر موجودگی سے بہت سے شہرت یافتہ شاعر اپنی شہرت کھو دیتے ہیں۔ نظمیؔ صاحب معروف ہوں یا غیر معروف، انھیں اپنے کلام کو سامنے لا کر کسی سے معذرت یا کسی کی تعریف و تنقیص کی ضرورت نہیں ہے۔

غزلیات

نہ تو ہجر کے، نہ وصال کے، نہ فسانے حُسن و جمال کے
مرے حرف حرف میں ہیں نہاں سبھی خواب تیرے خیال کے

میں رکوں کہ قصدِ سفر کروں؟ تری آرزو سے حذر کروں؟
ترے پاس کتنے جواب ہیں مرے ایک سادہ سوال کے

وہی رنگ ہے وہی روپ ہے، وہی سایہ ہے، وہی دھوپ ہے
تو یہ چہرے چہرے پہ کیوں لکھے ہیں فسانے گردِ ملال کے؟

کوئی رمزِ عشق لکھوں تو کیا ؟ کوئی ذکرِ شوق کروں تو کیا؟
نہ اشارہ اُس کی نگاہ کا ، نہ پیام بادِ شمال کے

جو ملے ہیں زخم بہار میں ، وہ متاعِ کوچۂ درد ہیں
یہ خزاں میں دیں گے سراغِ گل اِنھیں رکھ سکے جو سنبھال کے

جو لکھے گئے سو لکھے گئے ، جو نہ لکھ سکے وہ بکھر گئے
تھے ہزیمتوں کی نشانیاں سبھی تجربے سِن و سال کے

غم بہت ہیں دلِ دوستاں کے لیے
یہ زمیں کم نہیں آسماں کے لیے

لوحِ دل پر ہے سچائیوں کی زرہ
تم کوئی تیر لاؤ کماں کے لیے

کوئی تو لائے گا دھوپ کے سائباں
اِس اندھیری گلی کے مکاں کے لیے

لفظ لکھے ہیں میں نے بہت سوچ کر
میرا مکتوب ہے میری جاں کے لیے

پاؤں کے آبلے ، درد کی مشعلیں
کیا ہے رختِ سفر کارواں کے لیے

ذکرِ سود و زیاں کچھ ضروری نہیں
عہدِ رفتہ ! تری داستاں کے لیے

اُن چراغوں میں بھی اب نہیں روشنی
جگمگاتے تھے جو اک جہاں کے لیے

جانے کتنے نشیمن جلانے پڑیں!
اب کے تسکینِ برقِ تپاں کے لیے

قاتل ہے کہ مقتول ، یہ ہے شعلہ نوا کون؟
رہ رہ کے ہر اک گام پہ دیتا ہے صدا کون؟

لو ، ڈوب گیا ، چاند ! مرا چاند بھی آخر
اب روزنِ دیوار میں باقی ہی رہا کون؟

اک موجِ بلاخیز اُسے لے گئی ہم راہ
اب ریت پہ لکھے گا مرا نامِ وفا کون؟

پھر ختم ہوا آج کا دن بھی سرِ راہے
پھر اُس نے مجھے دیکھ کے پوچھا کہ یہ تھا کون

اِس سوچ میں اک عمر گزار آئے ہیں ، نظمیؔ!
ہے اِتنے خداؤں میں یہاں میرا خدا کون

ہر ایک بات پہ رہ رہ کے ٹوکنے والا
وہ کون ہے مرے بارے میں سوچنے والا؟

مآلِ شب زدگاں کا خیال کر لینا!
ستارۂ سحری بھی ہے ٹوٹنے والا

جہالتوں کے جزیرے میں ہو گیا مدفون
میں آگہی کے سمندر میں ڈوبنے والا

مرا وجود مری ذات کو کھٹکتا ہے
میں آئینہ ہوں مگر جھوٹ بولنے والا

اب اِس سے بڑھ کے مجھے کیا عذاب دے گا کوئی
کہ خود سے روٹھ گیا مجھ سے چھوٹنے والا

بس ایک قصۂ وصل و فراق سنتے ہیں
منانے والا ہے کوئی نہ روٹھنے والا

میں سن رہا ہوں کسی شخصِ بےنوا کی صدا
یہ کون ہے مرے لہجے میں بولنے والا؟

اگرچہ اب بھی تہی دست ہوں مگر میں نے
وہ جام پھینک دیا، تھا جو ٹوٹنے والا

دانے دانے کو اگر دام نہ جانے کوئی
تجھ کو بھی ، گردشِ ایام ! نہ جانے کوئی

شہر در شہر ہے اُس شخص کی شہرت مجھ سے
اور میں ہوں کہ مرا نام نہ جانے کوئی

بند دروازوں پہ دستک تو ہوئی ہے لیکن
کون آیا ہے سرِ شام نہ جانے کوئی

سب نے باندھے ہیں مضامین قفس کے ، یارو!
کیا گزرتی ہے تہِ دام ، نہ جانے کوئی

ہر قدم جہد و عمل ، جذب و طلب ، شوقِ نمو
دلِ دھڑکنے کا یہ پیغام نہ جانے کوئی

موسمِ وصل ہو یا ہجر کی رُت کی لذت
ہم سے بڑھ کر دلِ ناکام نہ جانے کوئی

ہم بھی کہہ دیں گے اُسے جانِ غزل ، جانِ وفا
اِس کو اب طعنہ و دشنام نہ جانے کوئی

ہم نے لفظوں کو جِلا دی ہے لہو سے اپنے
ہم کو صورت گرِ اصنام نہ جانے کوئی

کیا خبر جسم ہوں کہ جاں ہوں میں!
ہوں مگر کچھ نہ کچھ جہاں ہوں میں

رات کی رات ہی یہاں ہوں میں
اور پھر حرفِ داستاں ہوں میں

اِس قدر تم قریب مت آنا!
بجھتے شعلوں کا اک دھواں ہوں میں

اب مرا راستہ نہ دیکھنا تم
اب فقط گردِ کارواں ہوں میں

یاد آؤں تو یاد کر لینا
گزرے لمحوں کی داستاں ہوں میں

راستوں کی اداسیاں تسلیم!
سلسلہ ہائے کارواں ہوں میں

یوں ہے وہ خواب سا اب آنکھوں میں
جیسے بے چہرہ سا یہاں ہوں میں

ذرۂ خاک ہوں زمیں کے لیے
آسمانوں میں آسماں ہوں میں

گل ہوئے جا رہے ہیں سارے چراغ
کن اندھیروں کے درمیاں ہوں میں؟

ذرہ ذرہ ہے گوش بر آواز
اے مرے ہم سفر! کہاں ہوں میں؟

یاد آتی رہی کس کس کی ادا! راستے بھر
اور سنتے رہے پیاروں کی صدا راستے بھر

چھوڑ آئے تھے جسے دور ، بہت دور کہیں
وہ مسلسل مرے ہم راہ رہا راستے بھر

پاؤں جس طرح کسی حلقۂ زنجیر میں ہوں
ہر قدم پر یہی محسوس ہوا راستے بھر

سر پٹکتے رہے صحرا میں بگولے کیا کیا
بین کرتی رہی کانوں میں ہوا راستے بھر

درد جس طرح چمک اٹھتا ہے لحظہ لحظہ
یوں ہی تڑپا دلِ اندوہ رُبا راستے بھر

تیرے کوچے کے مسافر، تری چاہت کے اسیر
تن بہ تقدیر رہے آبلہ پا راستے بھر

ریزہ ریزہ ہوا آئینۂ حالات کے ساتھ
ہم نے باندھا تھا جو پیمانِ وفا راستے بھر

اک عجب کیفیتِ خواب سے گزرے ہم لوگ!
اک عجب درد کا احساس رہا راستے بھر!

تھا سبھی کے لیے مسیحا وہ
بس مرا درد ہی نہ سمجھا وہ

ڈھونڈ لی چھاؤں غم گساروں نے
رہ گیا دھوپ میں اکیلا وہ

آخری بار اُس سے ملتے کیا؟
آخری بار ہی ملا تھا وہ

مجھ میں تو خود بڑے سمندر ہیں
تھا کوئی اور ہی جزیرا وہ

موج و طوفاں سے کھیلنے والے
سب کھڑے ہیں کنارے دریا ، وہ!

ایک ہم تشنگانِ دشتِ جنوں
اور اک کربلا کا پیاسا وہ

گھر والے بے گھر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟
دل سارے پتھر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

سرو سمن کو لوٹنے والے آدھی رات کے چور
ایسے لوگ اَمَر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

ہم اک آدھ غزل کے شاعر ، لفظوں کے غم خوار
ہم ہی حرف بدر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

ہم نے جن لمحوں کو عمر کا حاصل جانا ہو
وہ لمحے دوبھر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

ہم بھی مال و منال کی خاطر جائیں سمندر پار
خود سے شہر بدر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

جن تاروں نے منزلِ فردا ہم کو سجھائی ہو
وہ بھی گردِ سفر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

رات گئے گھر آنے والے شام سے گھر میں ہیں
سب کے حال دگر ہو جائیں ، آخر ایسا کیوں؟

یوں منتشر ہوئے ہیں مری زندگی کے رنگ
جیسے کوئی بکھیر دے سب روشنی کے رنگ

اِتنے گریز پا بھی نہ تھے ہم غریبِ شہر
کیوں خواب خواب ہو گئے اپنی گلی کے رنگ؟

اک رشتۂ امیدِ ملاقات کے سبب
ہم جی رہے تھے ساتھ لیے بےبسی کے رنگ

اور اب کہ چور چور ہوا شیشۂ خیال
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ہم زندگی کے رنگ؟

اپنی صلیب آپ اٹھائے گزر گیا
قوسِ قزح نے پائے نہ اُس آدمی کے رنگ

دیوار ۔ سرحدوں کی مرے راستے میں تھی
مجھ کو پکارتے رہے دل بستگی کے رنگ

سایہ کہیں ملے بھی تو نکلوں میں دھوپ سے
مجھ پر ابھی محیط ہیں میری خودی کے رنگ

اپنے لہو سے دیپ جلاتا ہوں میں کہ ہیں
میری نگاہ میں مری خلوت گری کے رنگ

یہ بات اُس کے سمجھنے کی تھی ، وہ سمجھا نہیں
صلیبِ وقت کوئی چوم لے تو مرتا نہیں

عجیب حبس کا عالم ہے مجلسِ جاں میں
کوئی دریچہ کسی شہ نشیں میں کھلتا نہیں

طلسمِ تیرگیِ شب نہ ٹوٹ جائے کہیں!
کہ دسترس میں مری صبح کا ستارا نہیں

نہ کوئی ہجر کا لمحہ ، نہ وصل کی ساعت
ترا خیال ! ترا بھی خیال آتا نہیں

یہ احتیاط رہِ عشق میں ضروری تھی
کہ وہ قریب سے گزرا ، قریب آیا نہیں

ہے اُس کا نام بھی روشن چراغِ دل کی طرح
چراغ دل کا فروزاں ہوا تو بجھتا نہیں

سارے الزام اُس کے سر جائیں
لوگ زندہ رہیں کہ مر جائیں

دل بہت چاہتا ہے گھر جائیں
یا اِسی دشت میں بکھر جائیں

ہم کھڑے ہیں عجب دوراہے پر
بول ، اے ہم سفر ! کدھر جائیں؟

درد احساس کے جگاتے رہو
ہجر کے زخم لاکھ بھر جائیں

منزلوں کے تو راستے ہیں بہت
ہم کسی راہ سے گزر جائیں

ذہن بیدار ہیں اور لوح و قلم جاگے ہیں
دل سب اک ساتھ دھڑکتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

رنگ بن کر رخِ ہستی پہ بکھر جائیں گے
درد جتنے بھی تہِ تیغِ ستم جاگے ہیں

اب تو کچھ دور نہیں منزلِ اربابِ وفا
اب جنوں تیز ہے ، اب نقشِ قدم جاگے ہیں

شور گلیوں سے اٹھا اور گھروں تک پہنچا
در و دیوار بھی کہتے ہیں کہ ہم جاگے ہیں

تیری نیندیں بھی اُڑی ہیں مری نیندوں کی طرح
اب ترے دل میں بھی الطاف و کرم جاگے ہیں؟

اور ، کچھ اور فزوں تر ہو یہ احساس کی لہر
دل میں سوئے ہوئے جذباتِ الم جاگے ہیں

کتنے ہنگامے اٹھے ہیں سرِ مے خانۂ شوق!
مدتوں بعد یہ پیرانِ حرم جاگے ہیں

کج کلاہانِ زمانہ ! کوئی تدبیر کرو
تیشۂ وقت سے پتھر کے صنم جاگے ہیں

روحِ احساس بھی جاگی کہ ترے ہجر نصیب
رات بھر ، صبحِ تمنا ! کی قسم جاگے ہیں

طے کرو مرحلۂ گیسوئے دوراں ، نظمیؔ!
پیچ در پیچ کسی زلف کے خم جاگے ہیں

نغمہ بھی وہی اور وہی نغمہ رُبا ہے
یہ درد کا سنگیت لیے کون گیا ہے؟

ہرچند کہ بارش بھی ہوئی ، دھوپ بھی نکلی
لیکن وہی موسم ، وہی مغموم فضا ہے

جاگے ہیں شفق رنگ اجالے بھی ہر اک سمت
سویا ہوا اِنسان بھی بیدار ہوا ہے

صدیوں کی تھکن آنکھ کے پردے میں چھپائے
سر اپنا جھکائے ہوئے مزدور کھڑا ہے

بھڑکائے ہیں نفرت کے الاؤ بھی کسی نے
چاہت کے دریچے بھی کوئی کھول رہا ہے

کب ہم نے جلائے نہ چراغ اپنے لہو سے
کب جور و ستم آپ نے ہم پر نہ کیا ہے

ممکن ہے کہ سوکھے ہوئے کھیتوں پہ برس جائے
بادل تو بہت جھوم کے اِس بار اٹھا ہے

نظمیؔ ! ہے سخن فہمی کا دعویٰ اب اُنھیں بھی
جن عقل کے اندھوں نے لکھا ہے نہ پڑھا ہے

پھر در و بام گھر کے یاد آئے
پھر وہ ساماں سفر کے یاد آئے

منزلِ شوق کے قریب آ کر
فاصلے رہ گزر کے یاد آئے

آج تجدیدِ آرزو کر کے
سلسلے اُس نظر کے یاد آئے

تجھ کو اپنا کے جانے کیوں مجھ کو
حادثے عمر بھر کے یاد آئے

تیرگیِ شبِ ستم کے سبب
گیت کیا کیا سحر کے یاد آئے

سامنے پھر نگارِ وقت آیا
پھر تقاضے نظر کے یاد آئے

ہم سے وفا شعار بھی کیسی نگہ بدل گئے
کارِ ثواب کے لیے کارِ گنہ میں ڈھل گئے

سن کے صدائے بازگشت اہلِ جنوں کے قافلے
جادۂ اعتبار سے دور کہیں نکل گئے

میرا چراغِ زندگی بجھ بھی گیا تو غم نہیں
دیکھنا تم کہ میرے بعد کتنے چراغ جل گئے

تازہ ہوائے فصلِ گل دل کے چمن کھلا گئی
جھونکے سمومِ وقت کے موجِ صبا میں ڈھل گئے

یہ بھی ہے سچ کہ ہم سے ہی راہِ وفا نہ طے ہوئی
تم بھی تو اِتنے سال میں جانے کہاں نکل گئے

صبح سے شام ہو گئی کش مکشِ خیال میں
آنکھوں میں خوابِ گل لیے ہم بھی ذرا سنبھل گئے

بارشِ سنگ ہو چکی شیشہ بہ شیشہ ، دل بہ دل
فکر و نظر کا ذکر کیا ، لفظ و بیاں بدل گئے

نظمی ! نہ چل سکے ہمیں منزلِ شب کی چاہ میں
آبروئے نظر لیے لوگ تو سر کے بل گئے

وہ ایک شخص جو میری نظر میں رہتا تھا
مری تلاش میں پہروں سفر میں رہتا تھا

نہ جانے کس کے خیالوں میں کھویا کھویا سا
وہ اجنبی کی طرح اپنے گھر میں رہتا تھا؟

اُسے بھلا کے بہت مطمئن تھا میں ، پھر بھی
خیال سا دلِ وحشت اثر میں رہتا تھا

کڑی کمان سے چھوٹا ہوا سا تیر تھا وہ
حصارِ عرصۂ شام و سَحر میں رہتا تھا

کبھی قریبِ سَحر تھا، کبھی سَحر سے بھی دور
ستارۂ شبِ ہجراں سفر میں رہتا تھا

دھنک کے رنگ سے بکھرے تھے اُس کے چار طرف
وہ شعلۂ غمِ پنہاں شرر میں رہتا تھا

نہ ڈوبتا تھا، نہ ڈوبا سفینۂ احساس
اگرچہ موج کی صورت بھنور میں رہتا تھا

یوں ترے ہجر کا سودا ٹھہرا
آنکھ جھپکی نہ سویرا ٹھہرا

دن جو گزرا تو یہ محسوس ہوا
لمحۂ عرضِ تمنا ٹھہرا

چاندنی اپنا سفر بھول گئی
چاند آ کر لبِ دریا ٹھہرا

بھیگی پلکوں پہ دیے جلنے لگے
رقص کرتا ہوا لمحا ٹھہرا

کیوں نہ تلخابۂ احساس ہوں
جب مجھے زہر ہی پینا ٹھہرا

گھر کے دروازوں پہ دستک دے کر
پھر کوئی جھونکا صبا کا ٹھہرا

دنیا کی آب و تاب نہ دنیا دکھائی دے
سورج چمک رہا ہو تو سایا دکھائی دے

اندھے کنویں میں ڈوب رہا ہے ہر ایک شخص
تنہائیوں میں کیا کوئی اپنا دکھائی دے!

مردہ روایتوں کے تلے دب کے رہ گئے
زندہ حقیقتوں میں بھلا کیا دکھائی دے!

دل ہے شکست و ریخت کی دنیا لیے ہوئے
اور آنکھ چاہتی ہے تماشا دکھائی دے

گہرے سمندروں کی طرح چپ نہ سادھیے
ایسا نہ ہو کہ ہر کوئی دریا دکھائی دے!

اُس وقت تک رہے گا بکھیڑا وجود کا
جب تک نہ اپنی ذات میں دنیا دکھائی دے

جو نقش بھی میں وقت کے کاغذ پر کھینچ دوں
وہ نقش زندگی کا صحیفا دکھائی دے

برگد کا بوڑھا پیڑ ہے صدیوں سے منتظر
گوتم کو پھر نجات کا رَستا دکھائی دے

غالبؔ کے شعر ، میرؔ کا دیوان حفظ کر
شاید تجھے غزل کا سراپا دکھائی دے

نظمیؔ ! یہ شورِ ابر و ہوا ، یہ سماں ہے خوب
بادل مگر کہیں تو برستا دکھائی دے

خیال و خواب کی دنیا سے بے خبر ہے ابھی
مری حیات حقیقت گہِ نظر ہے ابھی

میں جانتا ہوں ، مری زندگی کا ہر لمحہ
ترے وجود کے مانند معتبر ہے ابھی

رہائی کیا ہو قفس سے کہ قوتِ پرواز
اسیرِ حلقۂ زنجیرِ بال و پر ہے ابھی

ٹھہر بھی جاؤں سرِ منزلِ خیال تو کیا؟
نفس نفس مرا آمادۂ سفر ہے ابھی

بجا یہ سلسلۂ شوق و جستجو ، لیکن
مجھے خیالِ پذیرائیِ ہنر ہے ابھی

ابھی اٹھا ہی کہاں ہے حجابِ موسمِ گل
کہ سرفرازیِ ہر شاخِ بےثمر ہے ابھی

میں صرصرِ غمِ دوراں سے بجھ نہیں سکتا
مرا ستارۂ احساس جلوہ گر ہے ابھی

ہمارے نام سے آغازِ عہدِ نو ہوگا
ہمارے پیشِ نظر ذات کا سفر ہے ابھی

تمھاری یاد سے ہم جاوداں بنا لیں گے
یہ اپنی زیست کا لمحہ جو مختصر ہے ابھی

میں ڈھل رہا ہوں ابھی فکر و فن کے سانچے میں
مری نوا مرے لہجے سے بےخبر ہے ابھی

صبحِ خیال ، شامِ تمنا سے کیا ملا؟
اکثر یہ سوچتا ہوں کہ دنیا سے کیا ملا

زعمِ جنوں میں خود کو فنا کر کے رہ گئی
طوفاں کی موج موج کو دریا سے کیا ملا؟

تشنہ تھے اور آج بھی ہیں تشنہ لب بہت
اہلِ طلب کو گردشِ مینا سے کیا ملا؟

بس یہ کہ دن گزار دیے اک امید پر
ورنہ ہمیں تصورِ فردا سے کیا ملا؟

میرؔ و یگانہؔ ، غالبؔ و مومنؔ کے دیس میں
نظمیؔ ! سخن وری کی تمنا سے کیا ملا؟

بھٹک نہ جائیں کہیں رہ گزارِ الفت سے!
پکاریے نہ ہمیں اِس قدر محبت سے

کریں گے اور کوئی اہتمامِ موسمِ گل
گذر ہوا جو ہمارا دیارِ وحشت سے

تراش لیں گے فسانے ہزار دنیا میں
گریزپا نہ ہوئے ہم اگر حقیقت سے

یہ روشنی یہ ہوا ، یہ بہارِ لالہ و گل
زمیں کے خواب حسیں ہیں خیالِ جنت سے

گماں گزرتے ہیں دل میں نہ جانے کیا کیا کچھ
ترے خطوط کی الجھی ہوئی عبارت سے

غزل کہو کہ لکھو قصہء جہاں ، نظمی!
فرار کی کوئی صورت نہیں روایت سے

جو بام و در پہ چراغاں تلاش کرتے ہیں
وہ لوگ کب کوئی عنواں تلاش کرتے ہیں

یہ زخم صورتِ آئینہ بن گئے ، اور ہم
اِنھیں میں چہرۂ یاراں تلاش کرتے ہیں

جنونِ شوق ! ترے حوصلے بلند رہیں
کہ ہم بھی جیب و گریباں تلاش کرتے ہیں

یہ واقعہ ہے کہ ہم ایک آرزو کے لیے
ہزار شوقِ فراواں تلاش کرتے ہیں

کبھی خزاں سے نبردآزما ہیں اہلِ چمن
کبھی بہار کے ساماں تلاش کرتے ہیں

غرض کہ کش مکشِ عہدِ نارسائی میں
سب اپنے درد کا درماں تلاش کرتے ہیں

جلا کے مشعلِ افکارِ زندگی ، نظمؔی!
ہم آتشِ دلِ سوزاں تلاش کرتے ہیں

اندازۂ ثوابت و سیار کر چکے
ہم امتحانِ طالعِ بیدار کر چکے

مژدہ چراغِ ہجر کی تنہائیوں کو دو
ہم اعتبارِ وعدۂ دیدار کر چکے

تجھ سے نہیں گلا کہ ترے واسطے سے ہم
دل کو غمِ جہاں میں گرفتار کر چکے

اب دوپہر کی دھوپ ہے اور دشتِ زندگی
آرام زیرِ سایۂ دیوار کر چکے

کیا جانے ، کیا ہو منصفِ دوراں کا فیصلہ
جرمِ وفا تو ہم سے خطا وار کر چکے

بجھا سکی نہ ہوائے ستم تو یاد آیا
مجھے چراغِ سرِ رہ گزار ہونا تھا

نہ ٹوٹ جائے حصارِ طلسمِ خواب کہیں!
جگا رہا ہے مجھے نیمِ شب کا سناٹا!

قدم قدم پہ ستارے بچھا دیے تم نے
میں چاہتا تھا گزر جائے زندگی تنہا

رفاقتیں بھی ضروری تھیں زندگی کے لیے
کہاں تلک میں تجھے یوں ہی دیکھتا رہتا؟

یہ کم نہیں کہ ہوا و ہوس کی دنیا میں
نہ میں کسی کا پجاری ، نہ میں کسی کا خدا

تلاش کر نہ سکی خود مری نگاہ مجھے
ہر آئینے میں کوئی اجنبی سا چہرہ تھا

کچھ ایسا دورِ کم آزار آ گیا ، نظمیؔ!
خیالِ دشت نوردی بھی ساتھ دے نہ سکا

اور بھی لوگ ہیں منسوب اِسی نام کے ساتھ
ہم ہی وابستہ نہیں گردشِ ایام کے ساتھ

وقت چپ چاپ مہ و سال میں ڈھل جاتا ہے
صبحِ فردا کی تمنا میں ہر اک شام کے ساتھ

دشت کی چاہ میں کب دادِ جنوں ملتی ہے
کاش ہم گھر کو لٹاتے نہ اِس اِلزام کے ساتھ!

ختم تھا قافلۂ منزلِ ہستی کا سفر
کوئی آغاز نہ ہوتا اگر انجام کے ساتھ

کتنی صدیوں کی رفاقت کا پتا دیتا ہے
اک تعلق سا جو اب تک ہے ترے نام کے ساتھ

ہم بھی ہیں راہ روِ راہِ محبت ، نظمیؔ!
لیکن آوارگیِ شوق کے الزام کے ساتھ

سوزِ نشاطِ درد سے ہم اجنبی نہ تھے
تھے غم زدہ ضرور پر اِتنے کبھی نہ تھے

اُن کو متاعِ عہدِ محبت ہوئی نصیب
جو لوگ تیرے پیار کے بھی مدعی نہ تھے

کس رشتۂ خیال سے رکھتے تجھے عزیز؟
آسودگانِ کوئے ملامت سبھی نہ تھے

اک اجنبی صدا ہمیں بیدار کر گئی
ہم تو حصارِ خواب سے نکلے ابھی نہ تھے

اک جرأتِ نمو کے سبب جی رہا ہوں میں
ورنہ یہ حادثات مری زندگی نہ تھے

نظمیؔ ! چراغِ شامِ الم نے سنائے ہیں
وہ قصۂ طرب جو ہمیں یاد بھی نہ تھے

لفظوں سے دل و ذہن کو تسخیر نہ کیجئے
زائل اثرِ خوبیِ تقریر نہ کیجیے

ہاں ! ہم بھی مٹا دیں گے نشانِ در و دیوار
اِس دشت میں گھر آپ بھی تعمیر نہ کیجیے

سچ ہے کہ یہاں کون ہے دمساز کسی کا
ممکن ہو تو آپ اور یہ تقصیر نہ کیجیے

ہم لوگ ہی آوازِ جہانِ گزراں ہیں
لب بستہ ہمیں صورتِ تصویر نہ کیجیے

ہر خواب نہیں پیکرِ اظہارِ حقیقت
ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ کیجیے

کٹ جائیں گے زنداں میں اسیری کے یہ دن بھی
احساس کو وابستۂ زنجیر نہ کیجیے

جو لوگ کہ اک مصرعِ تر کہہ نہیں سکتے
کہتے ہیں ، میاں ! پیرویِ میؔر نہ کیجیے

پلکوں پہ آنسوؤں کو سجائے ہوئے ہیں لوگ
کب سے صلیبِ درد اٹھائے ہوئے ہیں لوگ

ہو قاتلانِ شہر کو مژدہ کہ اِن دنوں
اپنے لہو میں آپ نہائے ہوئے ہیں لوگ

اب اور تم فریبِ طلوعِ سحر نہ دو
یہ راز مدتوں سے چھپائے ہوئے ہیں لوگ

حالانکہ صرصرِ غمِ دوراں ہے تیز تر
پاؤں مگر زمیں پہ جمائے ہوئے ہیں لوگ

سارے چراغ تم نے بجھا بھی دیے تو کیا!
دل کے دیے ہنوز جلائے ہوئے ہیں لوگ

اے دل ! نہ چھیڑ سلسلۂ یادِ رفتگاں
کس کس کو جانے کیسے بھلائے ہوئے ہیں لوگ

دھندلا نہ جائے روشنیِ چشمِ خودنگر!
سورج سے آج آنکھ ملائے ہوئے ہیں لوگ

نظمؔی ! وہی ہے عالمِ احساسِ تشنگی
کہنے کو دل کی پیاس بجھائے ہوئے ہیں لوگ

یہ وہ زخم ہے جو کِھلا نہیں ، یہ وہ درد ہے جو بڑھا نہیں
کوئی کیا بتائے کہ زندگی بجز اہتمامِ وفا نہیں

نہ ستارۂ شبِ غم کوئی ، نہ چراغِ صبحِ ستم کوئی
ترے ہجر سے ترے قرب تک کوئی اور اپنے سوا نہیں

وہ جو ایک رشتۂ درد تھا ، وہ جو سلسلہ تھا خیال کا
زہے اِلتفاتِ غمِ جہاں کہ وہ سلسلہ بھی رہا نہیں

کئی نام ایسے ہیں ذہن میں، کئی چاند ایسے گہن میں ہیں
جنھیں گردشِ مہ و سال سے کسی پل سکون ملا نہیں

جو نفس نفس کو جگا سکا نہ دلوں کی پیاس بجھا سکا
یہ نشاطِ مے کا وہ دور تھا کہ چراغِ بادہ جلا نہیں

جو برس برس میں بہم ہوئے، وہی ایک پل میں بکھر گئے
کئی خواب حاصلِ زیست تھے، سو کہیں اب اُن کا پتا نہیں

نکھری تھی ذرا دیر کو حالات کی صورت
پھر تیرگی بڑھتی ہی گئی رات کی صورت

کچھ ہم بھی متاعِ دل و جاں لے کے چلیں گے
نکلے تو سہی اُن سے ملاقات کی صورت

احساس کی لَو تیز ہوئی جاتی ہے ، یارو!
کاٹے نہیں کٹتے ہیں یہ دن ، رات کی صورت

ہاں ! آج یہ سر بھی ہے تری نذر ، مگر کل
کیا ہوگی خدا جانے مدارات کی صورت

برسے ہیں سرِ آبِ رواں جھوم کے بادل
اور خشک زمیں تکتی ہے برسات کی صورت

وہ دُکھ جو طلب گارِ مداوا ہیں ابھی تک
ہر چہرے پہ لکھے ہیں سوالات کی صورت

پتھر بھی جو آیا تری جانب سے تو ہم نے
پلکوں سے چنا ہے تری سوغات کی صورت

کیا فکرِ سخن کیجیے نظمؔی کی غزل میں
مشکل سے نکلتی ہے نئی بات کی صورت

ہو کر دیارِ طوق و سلاسل سے آئے ہیں
وہ قافلے جو لوٹ کے منزل سے آئے ہیں

ہم سربلند آج بھی ہیں، کل بھی تھے، مگر
نادم ہیں اس لیے کہ مقابل سے آئے ہیں

کس کو نصیب صحبتِ یارانِ رفتگاں
لیکن وہ لوگ جو تری محفل سے آئے ہیں

زادِ سفر ہے ایک یہی نقدِ جاں کہ ہم
رہ زن کو پوچھتے ہوئے منزل سے آئے ہیں

نظمیؔ ! اُنھیں بھی دعوتِ فکر و نظر کہ جو
بچ کر غمِ جہاں کے مسائل سے آئے ہیں

موسم کی دھوپ چھاؤں ، بہاروں کے پیچ و خم
اوراقِ گل پہ کتنے فسانے ہوئے رقم!

شاید کہ یہ نہیں ہے مری منزلِ حیات
رکنا بھی چاہتا ہوں تو رکتے نہیں قدم

آنکھیں ترس رہی ہیں اسی شہر کے لیے
جس شہر میں رہے تھے گھڑی دو گھڑی کو ہم

جامِ جہاں نما نہ عطا ہو مجھے کہ میں
کرتا نہیں پسند بہ تکرارِ بیش و کم

کشتیِ جاں ہے موجِ حوادث کے درمیاں
دریا کے پار تم ہو نہ دریا کے پار ہم

خود بڑھ کے آئیں گے جنھیں چلنا ہے ساتھ ساتھ
نظمیؔ ! چلیں گے آپ کہاں تک قدم قدم؟

یوں مبتلا ہوئے ہیں غمِ راہ زن میں ہم
خود آ گئے ہیں حلقۂ دار و رسن میں ہم

اے غم شناسِ دیدہ و دل ! کچھ بتا ہمیں
کیوں اجنبی سے لگتے ہیں اپنے وطن میں ہم؟

کچھ ہم بھی جانتے ہیں پذیرائیِ جنوں
شامل تھے اب سے دور تری انجمن میں ہم

کیا کج کلاہیِ غمِ دوراں رقم کریں
رسوا بہت ہوئے ہیں اِسی بانکپن میں ہم

نظمیؔ ! وہ شامِ ہجر گزر بھی گئی تو کیا
اب تک ہیں ایک عالمِ رنج و محن میں ہم

خود کو جو صورتِ دریا مجھے
کیا ہوس مندیِ صحرا سمجھے

تیرگی بار نظر تھی ، پھر بھی
شام کو لوگ سویرا مجھے

لوگ گرتی ہوئی دیواروں کو
دھوپ ایسی تھی کہ سایا مجھے

ہم ترے غم کی توجہ کے سبب
اضطرابِ غمِ دنیا سمجھے

چاند دیکھا جو سرِ مقتلِ جاں
تیرے ابرو کا اشارا سمجھے

ایک احساس کو سو نام دیے
صاحبِ عشق تجھے کیا سمجھے؟

ہائے ! وہ قرب کے لمحے ، نظمی
عمر بھر ہم جنھیں اپنا سمجھے

دشمن سے مل رہے ہیں بعنوانِ دوستی
اہلِ خرد کو آج یہ توفیق تو ہوئی

شاید تجھے خیال بھی آیا نہ ہو کبھی
کیسے ترے بغیر گزرتی ہے زندگی

بارآوریِ نخلِ تمنا کسے نصیب
نیرنگِ آرزو سے بہلتا رہا ہے جی

اِس دوپہر کی لُو نے تو کھلا دیے ہیں دل
اور شام کی ہوا سے توقع نہیں کوئی

سن کر خزاں سے قصۂ فصلِ بہار ہم
نظمیؔ ! بہت اُداس رہے اب کے سال بھی

آتشِ زیرِ پا کہا جائے
بے سکوں دل کو کیا کہا جائے؟

شامِ ہجراں ! ترے وسیلے سے
کس کو دردآشنا کہا جائے؟

وقت کا فیصلہ اہم ہوگا
کون قاتل تھا ، کیا کہا جائے؟

داستانِ شبِ ستم ! کب تک
صبح کا ماجرا کہا جائے؟

گل سے تشبیہ تا بکَے ؟ اے دوست!
آبلہ آ بلا کہا جائے

پیشِ نظر ہے مرحلۂ دار ، دوستو!
کن منزلوں کے ہم تھے طلب گار ، دوستو!

ہیں جسم اِس طرف تو دل و جاں ہیں اُس طرف
کیسی کھنچی ہوئی ہے یہ دیوار ، دوستو!

کیا کیا نہ یاد آئے ہیں، ماضی کے صبح و شام
دیکھا کہیں جو سایۂ دیوار ، دوستو!

برگِ خزاں رسیدہ کی صورت بکھر گئے
لمحے مسرتوں کے پھر اک بار ، دوستو!

رسوائیاں ملیں نہ کوئی زخمِ سر ملا
لیکن مجھے وفا کا صلہ عمر بھر ملا

دنیا کے دُکھ وسیلۂ اظہار بن گئے
جب سے مجھے سلیقۂ عرضِ ہنر ملا

شامِ فراق ! ایک ترے دھیان کے سوا
ہر سلسلہ خیال کا نامعتبر ملا

ہم اپنے دائروں میں نہ محصور ہوں کہیں!
صحرا میں کیسا یہ غمِ دیوار و در ملا

ہم خود ہی سر جھکا نہ سکے ، اے غمِ جہاں!
ورنہ کہاں کہاں نہ ترا سنگِ در ملا

نظمؔی ! سوادِ شب سے گزرنے کے بعد بھی
اب تک نہ زندگی کو پیامِ سحر ملا

کہیں کیا حال ہم اپنا کسی سے
اٹھے سب دل گرفتہ اُس گلی سے

ہزاروں جام لَو دینے سے لگے ہیں
ہمارے شعلۂ لب تشنگی سے

کنول احساس کے پھر کھل اٹھے ہیں
ہوائے شوق کی وارفتگی سے

جنوں پر تہمتیں رکھتے ہیں کیا کیا
نہیں واقف جو حرفِ آگہی سے

سمٹتے جا رہے ہیں دشت و دریا
جنون و عقل کی ہمسائیگی سے

فسونِ تیرگی ٹوٹے گا ، نظمیؔ!
خود اپنے ذہن و دل کی روشنی سے

فریبِ آرزو پر زندگی نے
بدل ڈالے ہیں صدیوں کے قرینے

اندھیروں سے جو وابستہ ہوئے ہیں
وہ افسانے بھی چھیڑے زندگی نے

ہمیں ناواقفِ منزل نہ کہیے
ہمیں آواز دی تھی آپ ہی نے

نگاہِ تیر کم آمیز کر دے
بہت نازک ہیں دل کے آبگینے

کچھ ماضی کا غم ہے دل میں ، کچھ فکرِ مستقبل ہے
ہر لمحہ اِس وقت کا ، یارو ! اپنے دور کا حاصل ہے

اب کے موسمِ گل کے ہاتھوں حال عجب ہے گلشن کا
غنچہ غنچہ دشمنِ جاں ہے ، پتا پتا قاتل ہے

ہم نفسو ! محدود نہیں کچھ ذوقِ سفر اِن کانٹوں تک
اِس سے آگے راہِ طلب میں دار و رسن کی منزل ہے

دل کا سفینہ ڈوب کے ابھرا ، گو دریا پایاب نہیں
سیلِ بلا سے بچنے والو ! یہ بھی فریبِ ساحل ہے

اپنے غم سے بیگانہ تھے ، لیکن یہ معلوم نہ تھا
دنیا کے دُکھ درد میں ، نظمیؔ ! اپنا غم بھی شامل ہے

اگر ناواقفِ صحرا نہ ہوتے
تو ہم بھی شہر میں رسوا نہ ہوتے

کوئی کیا پوچھتا ، کیا ہم بتاتے؟
اگر اُس بزم میں تنہا نہ ہوتے

نہ ہوتا شعلۂ احساس روشن
جو دل مانوسِ غم اِتنا نہ ہوتے

جو اُس کا غم ہی راس آتا تو نظمیؔ!
ہم اِتنے خود سے بیگانا نہ ہوتے

کون کہتا ہے کہ تقدیرِ جہاں ہم نہ رہے؟
ہاں ! مگر شاملِ احساسِ زیاں ہم نہ رہے

یاد آتا ہے بہت آج بھی وہ شہرِ وفا
صورتِ نقشِ کفِ پا بھی جہاں ہم نہ رہے

جانے کن لوگوں سے مانوس ہوں اب وہ در و بام!
جن کے سائے میں بھی ، اے جانِ جہاں ! ہم نہ رہے

یوں تو صدیوں کی رفاقت نہیں ٹوٹا کرتی
جانے کیا تھا کہ سرِ کوئے بتاں ہم نہ رہے

ہم کہ ہر دور میں کرتے رہے تدبیرِ سَحر
شاملِ انجمنِ شب زدگاں ہم نہ رہے

پاسِ دل داریِ اسلوبِ غزل ہے ، اے دوست!
ورنہ کہتے کہ ترے غم میں تپاں ہم نہ رہے

ڈھل گیا وقت کے سانچے میں ہر اک غم ، نظمؔی!
یعنی خمیازہ کشِ نازِ بتاں ہم نہ رہے

ٹوٹ جائیں گے چھلکتے ہوئے پیمانے بھی
وقت تو بدل جائیں گے افسانے بھی

کیا خبر تھی کہ سرِ رہ گزرِ عشق مجھے
یاد آئیں گے غمِ دہر کے افسانے بھی

کل کہ جس شخص پہ ہوتا تھا خود اپنا دھوکا
کیا ضروری ہے مجھے آج وہ پہچانے بھی؟

شور ہے جوشِ بہاراں کا چمن میں شاید
نکہتِ گل سے مہک اٹھے ہیں ویرانے بھی

چھیڑ کر قصۂ اربابِ محبت ، نظمیؔ!
یاد آئے کئی بھولے ہوئے افسانے بھی

سمجھ سکیں گے وہ کیا عظمتِ بہار کبھی
ہوئے نہ جن کے گریباں بھی تار تار کبھی

ہر ایک بات کا انداز مختلف ہو جائے
خیال ہو جو مسرت سے ہم کنار کبھی

بھٹک رہا ہے ابھی تک خزاں کے صحرا میں
وہ قافلہ جو چلا تھا سوئے بہار کبھی

یہ غم کی دھوپ ، یہ تپتا ہوا سا دشتِ خیال
یہاں بھی ہوں گے شجرہائے سایہ دار کبھی

ہر اک سلسلۂ شوق و جستجو مل جائے
محیط ہو جو گریبانِ تار تار کبھی

بڑھے چلو یوں ہی ، نظمؔی ! کہ وقت کے لمحات
خود اپنا بھی نہیں کرتے ہیں انتظار کبھی

لاکھ ہوں پابندیاں ہر سو بہت
پھر بھی ہیں اظہار کے پہلو بہت

دامنِ احساسِ غربت کے لیے
ایک شعلہ کم ہے ، اک آنسو بہت

ذہن کی خوابیدہ آنکھیں کھولیے
فکر کے صحرا میں ہیں آہو بہت

ہاتھ آئے تو سہی موجِ شمیم
تحفۂ گل ہائے رنگ و بو بہت

سلسلہ ہائے رفاقت کیا کہیں!
یاد ہر منزل پہ آیا تُو بہت

رخ بدلنے دو ذرا حالات کا
جاں نثارانِ قد و گیسو بہت

زیست کی محرومیوں کے باوجود
نت نئے امید کے پہلو بہت

ہم جہاں آباد ہیں اِس شہر میں
روشنی کم ، تیرگی ہر سو بہت

جہدِ مستقبل نہ ہو ، نظمیؔ ! اگر
زندگانی ہو شکستہ خو بہت

اک حسرتِ گناہ کا انجام کیا کہیں
اب زندگی ہے دورِ ، سرِ شام کیا کہیں

ہم نے چنے ہیں پلکوں سے کانٹے خیال کے
اے آگہیِ فن ! ترا انعام کیا کہیں

اب تیری آرزو کو بہ ایں عمرِ رائیگاں
شوقِ فضول و حسرتِ ناکام ، کیا کہیں

نظمؔی ! نشاطِ دیدہ و دل کی کہانیاں
ہم کشتگانِ کوچۂ آلام کیا کہیں

فاصلے کچھ بھی سہی ، درد کا رِشتا ہے بہت
وہ بھی اپنی ہی طرح ہجر میں تڑپا ہے بہت

کیا پکاریں گے تجھے تیری طلب کے مارے
اُن کو عقبیٰ سے زیادہ غمِ دنیا ہے بہت

صرف مے ہی نہیں چھلکائی ہے اُن آنکھوں نے
جھوم کر ابرِ گریزاں بھی تو برسا ہے بہت

سانس لینا بھی ہے اِس دورِ خرد میں دشوار
جو بھی جس طرح گزر جائے ، وہ لمحا ہے بہت

حسرتِ سیر و تماشائے جہاں کیا کیجیے
آنکھ جو دیکھ رہی ہے ، وہ تماشا ہے بہت

کب تلک دھیان کی لہروں کو کرو گے محبوس؟
ہر طرف شورش و طغیانیِ دریا ہے بہت

کیا کسی راہ میں تھک ہار کے بیٹھیں ، نظمیؔ!
سامنے اپنے ابھی وقت کا صحرا ہے بہت

اجنبی رہ گزاروں کی سونی فضا اپنے غم سے بھی شاید ہے ناآشنا
ہر کسی بھولے بھٹکے ہوئے کارواں کو سمجھتی ہے اپنا ادا آشنا

ٹوٹتا ہی نہیں رات کا سلسلہ ، رہ گیا کس طرف صبح کا قافلہ؟
راستہ دیکھتے دیکھتے سو گئے چشمِ بےخواب کے باوفا آشنا

چاندنی نے جگائے ہیں افسوں بہت، دل کی بےتابیوں کے ہیں مضموں بہت
اِس بھرے شہر میں ، اک زمانہ ہوا ، کوئی اپنا بھی تھا چاند سا آشنا

شبنم و گل پہ قدغن سے ہے اک سماں ہر قدم پر، ہیں مصلوب لمحے تپاں
ہم نفس ، ہم نظر ، ہم زباں ، دیکھنا ! کون ہوتا ہے اب وقت کا آشنا

ایک دل تھا جو نذرِ بتاں ہوگیا ، ایک غم تھا جو صرفِ جہاں ہوگیا
تجھ سے مل کر بچھڑنا قیامت ہوا ، زندگی ہوگئی ہم سے ناآشنا

ہم نے ڈھونڈا بہت ، پر ملا ہی نہیں جگمگاتی ہوئی سرزمیں پر کہیں
وہ خلوصِ مجسم کہ جس کو کہیں آدمیت کے پندار کا آشنا

کیا بتائیں گے یہ اہلِ دیر و حرم ، آپ فرمائیں کچھ ، نظمیِ محترم!
کون ہے محرمِ رازِ بادہ کشاں ؟ کس کو کہتے ہیں سب مے کدہ آشنا؟

تجھ سے مانوس ہوئے ہیں جب سے
اک تعلق سا ہمیں ہے سب سے

شبنم آلود ہیں کلیاں دل کی
مجرمِ درد ہوئے ہیں جب سے

کوئی نوخیز شگوفہ نہ کھلا
باغ ویران پڑا ہے کب سے

کتنے نغمات فضا میں گونجے
ہم اسیروں کے سکوتِ لب سے

وہ خدا جانے کہاں ہو اِس وقت!
ہم یہی سوچ رہے ہیں کب سے

اے نئی فصل! تجھے کیا معلوم؟
پھول کھلتے ہیں شگفتِ لب سے

کارواں کوئی گزرتا ہی نہیں
راستہ دیکھ رہے ہیں کب سے

دَو گھڑی صبر کرو، ہم نفَسو!
صبح ابھرے گی سوادِ شب سے

قافلے اہلِ طلب کے، نظمیؔ!
آج گزریں گے فصیلِ شب سے

شوقِ وارفتگیِ قلب و نظر باقی ہے
یعنی اب بھی ہوسِ زخمِ جگر باقی ہے

دل کہ ہر مرحلۂ سود و زیاں سے گزرا
پھر بھی اک سلسلۂ نقد و نظر باقی ہے

اب کہاں انجمن آرائیِ رنگ و نکہت!
صحنِ گلشن میں فقط رقصِ شرر باقی ہے

سو گئے رات کی آغوش میں ماہ و انجم
رات لیکن ابھی تا حدِ نظر باقی ہے

اپنی آشفتہ خرامیِ نفس کیا کہیے
ایک سفر ختم ہوا ، ایک باقی ہے

ایک مرکز پہ سمٹ آئی ہے بے کیفیِ زیست
رونقِ شام نہ اب رنگِ سحر باقی ہے

تجھ سے کیا حالتِ افسردہ چھپائیں کہ ہنوز
غم کا ہر رنگ بہ اندازِ دگر باقی ہے

کاش دیکھیں نہ اب آنے والے!
جو ترے شہر میں دیکھا ہم نے

دل کا ہر زخم کیا ہے تازہ
چھیڑ کر غم کا فسانہ ہم نے

اُس کا غم بھی غمِ دوراں نکلا
اُس کو چاہا تھا بھلانا ہم نے

منزلِ عشق کی سرشاری میں
طے کیے ہیں کئی صحرا ہم نے

کچھ پتا ہی نہ ملا اُس گُل کا
ایک اک برگ سے پوچھا ہم نے

اُس نے پوچھا تھا ہمارا احوال
دل کو کیا کیا نہ سنبھالا ہم نے

سنگ ریزوں کی طرح بکھرے ہیں
خود کو کس درجہ مٹایا ہم نے!

چاکِ دامانِ گُل میں ، نظمیؔ!
روپ دیکھا ہے صبا کا ہم نے

اے گردشِ افلاک ! ترے لطف عجب ہیں
ہم تھے نہ طلب گارِ مہ و مہر ، سو اب ہیں

سوچا تو کئی بار ، کریں ترکِ تعلق
دیکھا تو یہ راہیں بڑی دشوارطلب ہیں

کچھ حُسن مزین بھی ہے انداز و ادا سے
کچھ ناز ترے اپنی توجہ کے سبب ہیں

پائی ہے جِلا ذہن کی آزادہ روی نے
جس وقت سے ہم اہلِ قلم مہر بہ لب ہیں

مایوس نہ ہو ، اے مرے تقدیر شناسو!
کچھ انجمِ خوابیدہ پسِ پردۂ شب ہیں

کیا شجرۂ حالات رقم کیجیے ، نظمیؔ!
اک عمر سے ہم سب یہاں بے نام و نسب ہیں

عشق جب سلسلہ جنباں نکلا
اِک نئے درد کا عنواں نکلا

سو گئے جاگتے لمحے آخر
وقت بے مہر شبستاں نکلا

قافلہ موسمِ گل کا اب کے
شہر سے چاک گریباں نکلا

سر پہ آیا جو ستم کا سورج
اپنا سایہ بھی گریزاں نکلا

نالہ کش تھا جو شبِ غم ، وہ گُل
صبح آئی تو غزل خواں نکلا

قیمتِ لالہ و گُل کیا ہوگی ؟
خونِ دل بھی جہاں ارزاں نکلا

دل عجب شہرِ طرب تھا ، نظمیؔ!
جس کا ہر ذرہ بیاباں نکلا

بدل گیا ہے مزاجِ زمانہ ، کہتے ہیں
کہ سچ کو لوگ سخن گسترانہ کہتے ہیں

سمجھ رہے ہیں جو مفہومِ دردِ عشق ، وہ لوگ
ہر اک ستم کو ترے دلبرانہ کہتے ہیں

کلی کلی ہے اُسی کے خیال سے لرزاں
جسے بہارِ چمن کا زمانہ کہتے ہیں

ہر ایک رازِ محبت سے آشنا نکلی
وہ اک نظر جسے نامحرمانہ کہتے ہیں

ہمیں فروغِ بہارِ چمن کا عنواں ہیں
ہمیں سے آپ خزاں کا فسانہ کہتے ہیں

ہم اہلِ دِل ترے حُسنِ سلوک کے قصے
ترے حضور نہیں ، غائبانہ کہتے ہیں

ہیں اُس جگہ پہ ترے خانماں خراب جہاں
قفس کو اہلِ چمن آشیانہ کہتے ہیں

بھری بہار میں وارفتۂ چمن ، نظمیؔ!
قفس کی سمت ہوئے تھے روانہ ، کہتے ہیں

پئے حرفِ شکایت لب نہ کھولو
ستم سہتے رہو اور کچھ نہ بولو

ہوا یکساں نہیں رہتی ہمیشہ
فضا میں زہر ہر لحظہ نہ گھولو

کوئی دم اور ہے یہ رنگِ موسم
نہالانِ چمن ! آنکھیں تو کھولو

بہت ہی مہرباں ہیں غم کے سائے
چلو ! اِس چھاؤں میں کچھ دیر سو لو

پئے صحرا نوردی ، ہم صفیرو!
کہے جس سمت دل ، اُس سمت ہو لو

تلاشِ منزلِ فردا میں ، نظمیؔ!
ہمارے کارواں کے ساتھ ہو لو

تیز تر کچھ وقت کی دھڑکن تو ہے
اک کرن امید کی روشن تو ہے

ہر گھڑی ، ہر پل کوئی الجھن تو ہے
زندہ رہنا کارِ مستحسن تو ہے

فکرِ تعمیرِ نشیمن ہو نہ ہو
شوقِ تزئینِ گل و گلشن تو ہے

اِس ہجومِ رنگ و بو میں بھی مجھے
کچھ خیالِ تنگیِ دامن تو ہے

اِس ہجومِ رنگ و بو میں بھی مجھے
کچھ خیالِ تنگیِ دامن تو ہے

لاکھ آئے موسموں کے انقلاب
قائم اپنی وضعِ پیراہن تو ہے

اب نظر سرشارِ جلوہ ہو نہ ہو
وہ پری چہرہ پسِ چلمن تو ہے

مطمئن ہیں یوں اسیرانِ چمن
شاخِ گل ہی برق کا خرمن تو ہے

دل بایں ہنگامہ ہائے درد و غم
بے نیازِ نالہ و شیون تو ہے

نظمیؔ ! اخلاص و وفا کی راہ میں
دوست کوئی ہو نہ ہو، دشمن تو ہے

جلوہ طرازیاں بھی سرِ بام دیکھنا
کیوں ساکنانِ شہر ہیں بدنام ، دیکھنا!

شیشے میں آفتاب کا عالم ہی اور ہے
بادہ کشو ! سنبھل کے ذرا جام دیکھنا

اٹھے تھے شوقِ گل میں بیاباں تک آ گئے
یارانِ خوش خرام کا انجام دیکھنا

آنکھوں میں نیند ، لب پہ تبسم ، مژہ پہ پھول
ہے سامنے وہ صورتِ گل فام ، دیکھنا!

تم پر نہ پڑ گئی ہو تمھاری کمندِ شوق!
تم خود نہ آ گئے ہو تہِ دام ، دیکھنا

جب بھی اُس انجمن میں چلیں گے خوشی کے دور
آئے گا بار بار مرا نام ، دیکھنا!

کھولے ہیں اُس نگاہ نے بے کیفیوں کے راز
ہے مےکدے میں گردشِ ایام ، دیکھنا!

نظمیؔ ! افق کے دونوں کنارے ہوئے ہیں سرخ
یہ اہتمامِ صبح ہے یا شام ، دیکھنا!

جب اسیرِ قد و گیسو نہ کوئی دل ہوگا
عقدۂ زیست کا حل اور بھی مشکل ہوگا

مضطرب لاکھ حوادث سے مرا دل ہوگا
پھر بھی آشفتگیِ زیست کا حاصل ہوگا

سینۂ سنگ سے پھوٹیں گے لہو کے دھارے
عشق جب بھی غمِ دوراں کے مقابل ہوگا

تیری محفل سے جب اٹھ جائیں گے ہم دل والے
تجھ کو اندازۂ بے کیفیِ محفل ہوگا

زخم تازہ ہیں اگر دُکھے تو اے نزہتِ گل!
دستِ گل چیں سے کوئی پھول نہ غافل ہوگا

دور وہ دن بھی نہیں ہیں کہ اِسی شہر کے بیچ
یوں نہ مقتل کا سماں ہوگا ، نہ قاتل ہوگا

دیکھیں ، اب گردِ ملامت کے علاوہ ، اے دوست!
اور کیا بادیہ پیمائی کا حاصل ہوگا

اور کچھ دن جو رہی گرمیِ پیکار تو پھر
لذتِ درد سے مانوس ہر اک دل ہوگا

لیلیٰ وقت کے دیوانوں سے کہہ دو ، نظمیؔ!
اب غبارِ رہِ پامال ہی محمل ہوگا

خزاں نصیبوں میں ذکرِ چمن ہی کیوں آیا؟
اسیر تھے تو یہ طرزِ سخن ہی کیوں آیا؟

کچھ اور رنگ بھی ہیں وحشتِ تمنا کے
مزاجِ عشق میں دیوانہ پن ہی کیوں آیا

حریفِ کج کلہاں بن کے بر بنائے جنوں
میں سوچتا ہوں ، کوئی کوہ کن ہی کیوں آیا؟

حکایتیں تو بہت تھیں تجھے سنانے کو
زباں پہ قصۂ دار و رسن ہی کیوں آیا؟

اگر دلوں میں نہیں ہے شگفتگی کی لگن
تو پھر خیالِ بہارِ چمن ہی کیوں آیا؟

ادب نواز کبھی اِس پہ کاش غور کریں!
ہوا کی زد پہ چراغِ سخن ہی کیوں آیا

اُسے خبر نہ تھی کتنا سبک ہے دلِ نظمیؔ
وہ درد لے کے سرِ انجمن ہی کیوں آیا؟

جان جائے کہ ہاتھ سے دل جائے
اے غمِ عشق ! کچھ سزا مل جائے

چل ذرا یوں بھی ، اے نسیمِ سحر!
غنچہ غنچہ ، کلی کلی کھل جائے

اِس توقع میں ہر طرف سے گئے
جانے کس راستے پہ تُو مل جائے

عشق کے ہاتھ میں ہے آئینہ
کون اب حُسن کے مقابل جائے

تو جو آ جائے ، اے بہارِ طرب!
دامنِ یادِ یار بھی سل جائے

اک ذرا سوئے مےکدہ چلیے
شیخ صاحب ! حیاتِ نو مل جائے

صرف اک اتفاق ہے ، نظمیؔ!
ورنہ دنیا میں دل سے دل مل جائے

دنیا کے دُکھ دل میں پلتے
جینے کے انداز بدلتے

پاؤں کے چھالے پھول بنے ہیں
راہِ طلب میں چلتے چلتے

رُت بدلے گی رفتہ رفتہ
دیر لگے گی وقت بدلتے

سوچ جو لیتے جشن سے پہلے
دیپ ہی جلتے ، دل تو نہ جلتے

عمر بڑی مشکل سے کٹی ہے
سیدھی راہ پہ چلتے چلتے

نظمیؔ ! صبحِ طرب تک آئے
غم کی آگ میں جلتے جلتے

کوئی آنسو ، کوئی جگنو ، کوئی تارا تو نہیں
میرے دامن میں ہے جو کچھ بھی ، شرارا تو نہیں

فصلِ گل کا کہیں مسموم اشارا تو نہیں!
دیکھنا ! غنچوں کو تخریب نے مارا تو نہیں

چہرہ اترا نظر آتا ہے مہ و انجم کا
میری پلکوں پہ ، شبِ غم ! کوئی تارا تو نہیں؟

ایک امید جھلکتی ہے پسِ پردۂ وقت
ورنہ یہ تلخیِ حالات گوارا تو نہیں

ظلمتِ شب میں تڑپ جاتی ہے اک بجلی سی
کارواں والو ! یہ منزل کا اشارا تو نہیں؟

میری پلکوں پہ بھڑک اٹھے ہیں اشکوں کے چراغ
دامنِ دوست میں رقصاں کوئی تارا تو نہیں؟

عمر بھر درد کا احساس جگائے رکھا
یورشِ غم سے بہر حال میں ہارا تو نہیں

ہر کلی چونک پڑی ، غنچوں نے انگڑائی لی
جانِ گلشن نے کہیں مجھ کو پکارا تو نہیں؟

چاند نکلا ہے نہ سورج ہی ابھی ڈوبا ہے
دیکھنا ! ہجر کا دن ہم نے گزارا تو نہیں

ہم نے بھی اپنا لہو صرف کیا ہے ، نظمیؔ!
باغباں ہی نے گلستاں کو سنوارا تو نہیں

ہم کہ ہستی کے رازداں بھی ہیں
ہم زمیں بھی ہیں ، آسماں بھی ہیں

ہر نظر میں ہزار افسانے
چپ بھی ہیں ، محوِ داستاں بھی ہیں

بے تعلق ہیں قافلے سے بھی
اور ہم اہلِ کارواں بھی ہیں

چھیڑوں کیوں نہ تذکرہ اُن کا؟
لوگ اب محوِ داستاں بھی ہیں

غمِ جاناں! ترے ستائے ہوئے
اب شکارِ غمِ جہاں بھی ہیں

بے نیازی ہے اک ادا، نظمیؔ!
ورنہ وہ مجھ پہ مہرباں بھی ہیں

جب تری نگاہوں نے اپنے دام پھیلائے
زندگی کے سینے سے کتنے راز ٹکرائے

جلوۂ بہاراں تک کاروانِ صبح آئے
کاش منزلِ شب کا کچھ سراغ مل جائے!

جن کو حُسنِ منزل نے دور سے لبھایا تھا
راستوں کی دشواری دیکھ کر پلٹ آئے

دردِ دل کے متوالو ! سوزِ عشق کے مارو!
نغمۂ جاں چھیڑو ، زندگی بہل جائے

ذہنِ غنچہ ساماں پر کیا گزر گئی ؟ یارو!
ذکرِ فصلِ گل آیا اور اشک بھر آئے

رہ گزارِ الفت میں اب جمود طاری ہے
دھندلے دھندلے لگتے ہیں رنگ و نور کے سائے

رنگ بن کے بکھرے ہیں، روپ بن کے نکھرے ہیں
سطحِ ذہن پر اکثر تیری یاد کے سائے

شام کے اندھیروں سے صبح کے اجالوں تک
روشنی کے افسانے زندگی نے دُہرائے

اے کشاکشِ دوراں ! تیرے لطفِ پیہم نے
کشتۂ محبت پر نت نئے ستم ڈھائے

قسمتیں بدلتی ہیں اُس نظر کی جنبش سے
ناصحِ مکرم کو کوئی جا کے سمجھائے!

مے کدے میں جب ، نظمیؔ ! تشنگی بڑھی حد سے
چشمِ مے گساراں نے کیوں نہ جام چھلکائے؟

بے گنہ بھی ، گناہ گار بھی ہم
کون معیارِ عدل پر ٹھہرے؟

دھوپ ہے تیز اور سفر دشوار
جو یہ سوچے ، وہ اپنے گھر ٹھہرے

سچ بھی اپنی شناخت کھو بیٹھا
ہم خطاوار کس قدر ٹھہرے!

ہیں دلیلِ صبح روشن یہ لٹے لٹے نظارے
یہ تھکا تھکا اندھیرا ، یہ بجھے بجھے ستارے

اِسی لذتِ توہّم نے دیے بڑے سہارے
بایں کاوشِ مسلسل نہ ملے اگر کنارے

جو رواجِ رسمِ کہنہ ذرا آسرا نہ دے دے
تو یہ بازیِ محبت کوئی جان کے نہ ہارے

شبِ ہجر دل کی دھڑکن نے بہت سکون بخشا
کوئی دھیمے دھیمے جیسے مجھے دور سے پکارے

میرے ہم سفر رفیقو ! ذرا اِن سے بچ کے رہنا
یہی گل ، یہی شگوفے مرے ساتھ بھی تھے سارے

میں فریب خوردہ راہی ، میں خرابِ گردِ منزل
مری جرأتوں نے لیکن کبھی حوصلے نہ ہارے

یہ جبیں شفق بداماں ، یہ رخِ حسین و تاباں
نہ خدا وہ دن دکھائے کہ اداس ہوں نظارے

نیا عزمِ سرفروشی مجھے بخشتے ہیں ، نظمیؔ!
غمِ زندگی کے طوفاں ، غمِ دوجہاں کے دھارے

اپنا دل بھی چونک پڑا ہے
دور کہیں غنچہ جو کھلا ہے

ایک حقیقت ، سو افسانے
جانے کس نے کیا سمجھا ہے!

سچی بات لبوں پر لا کر
ہم نے کتنا دُکھ پایا ہے!

شعلے شعلے ، دامن دامن
آگ کو کس نے بھڑکایا ہے؟

تیری یاد کی ٹھنڈک لے کر
چاند مرے دل میں اترا ہے

اُس کے غم میں لذت ہوگی!
ہم نے تو دُکھ ہی پایا ہے

ہم نے تیرا درد اپنا کر
دنیا بھر کا دُکھ سمجھا ہے

ہائے ! وہ لمحے عیش و طرب کے
جن سے دُکھ نے پیار کیا ہے

پھول کھلے ، کلیاں مہکی ہیں
نظمی ! کس کا نام لیا ہے؟

دل میں کچھ جذبۂ تکمیلِ نظر ہے کہ نہیں؟
تیرہ بختوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں؟

یہ دل آویز تبسم ، یہی ماتھے کی شفق
اِن پہ کچھ دیدۂ پُرنم کا اثر ہے کہ نہیں؟

میری دنیا میں بہاروں کا گزر ہے ، لیکن
اہلِ گلشن کو بہاراں کی خبر ہے کہ نہیں؟

کارواں ٹھہر گیا ہے سرِ منزل ، یارو!
اِس سے آگے بھی کوئی راہِ سفر ہے کہ نہیں؟

ناخدا ہم کو بھی لے ڈوبیں گے ساحل کے قریب
اہلِ طوفاں ! کہیں ساحل سے مفر ہے کہ نہیں؟

تیری پلکوں سے ڈھلکتے ہوئے اشکوں کی قسم!
میرے دامن پہ ستاروں کا گزر ہے کہ نہیں؟

ہم تو پہلے بھی تھے محرومِ عنایت ، نظمیؔ!
اب وہی بات بہ اندازِ دِگر ہے کہ نہیں؟

منظومات

یاد

رات کی بے کراں ظلمتوں میں
نرم و نازک سی ضو مسکرائی
یاس انگیز عالم میں دل کے
چپکے چپکے تری یاد آئی

یک بیک میرے ترسے ہوئے لب
ہو گئے آشنائے تبسم
دل کی ناکام سی حسرتوں پر
چھا گئے دفعتہً ماہ و انجم

ذہن و احساس نے کروٹیں لیں
اور تخئیل نے ایک پیکر
نور و نکہت میں ڈوبا ہوا سا
دھیرے دھیرے کیا یوں اجاگر

مست و مخمور سی وہ نگاہیں
دل کش و دل رُبا سی ادائیں
زلفیں زنجیرِ موجِ بہاراں
اُحمریں ، مرمریں سی وہ بانہیں

ہو گئیں مجھ سے محوِ تکلم
ڈال دیں میری آنکھوں میں آنکھیں
بخش کر مجھ کو کیفِ محبت
آرزوؤں کو دے کر ندائیں

میری جانب بڑھیں ، مسکرائیں
میرے جذب و طلب کو نکھارا

روٹھی یادوں کو پیہم منا کر
ناامیدی کو دے کر سہارا

کر گئیں مجھ سے پیمانِ الفت
شدتِ غم نے تسکین پائی
ہجر کی تیرہ تر ساعتوں میں
عزم و ہمت کی مشعل جلائی

کلفت و درد کی وادیوں میں
نرم و نازک سی ضو مسکرائی
یاس انگیز عالم میں دل کے
چپکے چپکے تری یاد آئی

شامِ طرب

دیکھ ! اِن مہکی ہوئی شوخ بہاروں کے قریب
کون آیا ہے لیے دستِ حنائی میں چراغ
کس نے بھڑکا دیے نوخیز امنگوں کے دیے
کس نے پہنچا دیا افلاک پہ کلیوں کا دماغ

رقص فرما سرِ گلزار ہے ساون کی ہوا
مسکرائی ہے محبت بھری وادی میں حیات
گنگناتی ہے شبستانِ تخیل میں نظر
چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کے کوئی راز کی بات

مست و مخمور ہے انفاس کی خوشبو سے جمال
دھڑکنیں دل کو دیے جاتی ہیں پیغامِ طرب
زلف بردوش ہے دوشیزۂ ماہ و انجم
محوِ دلداریِ جذبات ہے پھر شامِ طرب

آ کہ اک بار تجھے دل میں بسا لیں ، ہمدم!
مسکراتے ہوئے لمحات سجا لیں ، ہمدم!
یوں تو آفات ہی آفات ہیں جینے کے لیے
پھر بھی ، آ ، جشنِ طربناک منا لیں ، ہمدم!

اپنے سینے سے لگا لیں تجھے اک پل کو ذرا
سایۂ زلف میں کچھ دیر تو ہم بھی سو لیں
شاہراہِ غمِ دنیا کی کشاکش سے پرے
اپنے اسلاف کی میراث پہ ہنس لیں ، رو لیں

جمود

احساسِ فراواں کی　　تاثیر مچلتی ہے
دنیائے محبت کی　　تقدیر بدلتی ہے

ہے رقص میں پیمانہ　　ساقی کی نگاہوں سے
رہ رہ کے چھلکتی ہے　　موجِ مےِ مستانہ

کیا جانیے کیا ہوگا　　انجامِ ستم پیشہ
محرومِ عنایت پر　　کب ہوگا کرم اُن کا

کچھ سوچ کے چپ چپ ہیں
رندوں کی تمنائیں
کچھ جان کے ساکن ہیں
اِس وقت کی آشائیں

ورنہ مرے ہم رازو!
ہر ذہن کے دامن سے
شعلے سے لپکتے ہیں
انسان کی عظمت کے

احساس

شام کے نقرئی نقرئی سائے میں
چاند اپنی تمنا پہ شرما گیا
ہر شبِ ماہ تارے سلگتے رہے
قافلہ چاندنی کا گزرتا رہا

اور افق تا افق رقص کرتے رہے
جادۂ کہکشانی پہ زہرہ نفَس
قطرہ قطرہ ٹپکتا رہا عرش سے
تازہ تازہ بہاروں کے پھولوں کا رس

اور زمیں کی طرف مرگ کی وادیاں
حشر کا تند طوفاں اٹھاتی رہیں
زندگی آدمی سے گریزاں رہی
وقت کی دھڑکنیں مسکراتی رہیں

بامِ تعمیر پر جلوۂ منتشر
پھر سنورتے سنورتے بکھرنے لگا
اپنی معراج تک آگئی تھی نظر
یک بیک روئے مہتاب دھندلا گیا

چند نافہم رہبر اُسے بھی مگر
منزلِ زیست کی رفعتیں کہہ اٹھے
ہر قدم شاہراہِ عمل کے لیے
اُس کو اعجاز کی ندرتیں کہہ اٹھے

شب کے رخسار کی غازۂ خون سے
کر کے تزئین ہنستے، مہکتے رہے
اوجِ افلاک سے شورشِ دہر کی
نبض پر ہاتھ رکھے بہکتے رہے

سیم وزر کے پجاری ہراک رنگ میں
قلبِ گیتی پہ نشتر لگاتے رہے
خوابِ انسانیت چور ہوتا رہا
شب کو صبحِ منور بتاتے رہے

آخرِ کار اٹھنے لگا نیند سے
ایک مدت کا سویا ہوا آدمی
جاگ اٹھا تقاضائے ہستی سے دل
ہر نظر سے جھلکنے لگی زندگی

آخرِ شب

ہجر کے شبستاں میں یاد کے چراغوں سے
کس قدر اجالا ہے!
رنج و غم کے دامن میں زخمِ دل کی تابانی
کتنی روح فرسا ہے!
چاند اور تاروں سے ، شبنمی نظاروں سے
زندگی ہویدا ہے
سوچتا ہوں ، دنیا میں زیست کی تمنا میں
دل کو کون پیارا ہے

اک طرف غمِ دوراں ، اک طرف غمِ دل ہے
بخت کارفرما ہے
شورشِ حوادث سے زندگی کے آنچل میں
ٹوٹتا ستارا ہے
درد و غم سے گھبرا کر یادِ دوست کے ہاتھوں
دل کبھی جو بہلا ہے
بڑھ کے دردِ گیتی نے ، ہنس کے سیلِ پنہاں نے
یک بیک پکارا ہے
بے بسی کا طوفاں ہے ، آدمی پریشاں ہے
جانے کیا اشارا ہے!
رخصت، اے شبِ ہجراں! تیرے قرب سے بڑھ کر
وقت کا تقاضا ہے
کائنات کے غم کو دل میں جاگزیں کر لے
اور پھر سویرا ہے

مسلکِ اقوامِ جہاں

شام کی تیرہ فضاؤں پہ بکھرنے لگا نور
چاند نے دور ، بہت دور سے نظریں پھینکیں
اور بیدار ہوا جنسِ محبت کا شعور

جام چھلکے ، خم و مینا کی تمنا مچلی
درِ مے خانہ سے وابستہ ہوئے افسانے
رازِ سربستہ کی تشہیر کو دنیا نکلی

معبدِ دہر کے سفاک خدا کانپ گئے
نوعِ اِنساں نے ستاروں پہ کمندیں ڈالیں
اونچے آکاش پہ نقاشِ بلا کانپ گئے

خانقاہوں کے جگرسوز مناظر کے تلے
دیکھتے دیکھتے ہر ذہن سے نغماتِ حیات
اک نیا جوش ، نیا درسِ نمو پا کے چلے

اور چلتے رہے ، بڑھتے رہے ، بڑھتے ہی رہے
رفعتِ کوہِ ہمالہ کی فصیلوں کے امیں
امنِ عالم کے رجز شوق سے پڑھتے ہی رہے

لندنی حیلہ تراشوں کا ستم خیز جنوں
تیسری جنگ کے شعلوں کو ہوا دیتا رہا
وادیِ نیل میں بہتا رہا انسان کا خوں

لیکن اب وقت کے بدلے ہوئے انداز کے ساتھ
بزمِ آفاق سے ہر خطرۂ ظلمت کا فسوں
ٹوٹتا ہوگا نئے دور کے آغاز کے ساتھ

ہر قدم پر یہ تباہی ، یہ مصائب ، یہ الم
امن و تہذیب کے معمار اِسی سوچ. میں ہیں
کس طرح ختم ہو یہ سلسلۂ جور و ستم

آج فاشسٹ درندوں کو مٹانے کے لیے
متحد ہونے لگیں امن کی حامی فوجیں
جنگ کے لشکرِ تخریب پہ چھانے کے لیے

اہلِ دنیا کی صدا امن و اماں ٹھہری ہے
آشتی مسلکِ اقوامِ جہاں ٹھہری ہے

استقبال

اے بہارِ گل و یاسمن ! مسکرا
میں نے تیرے لیے زندگی کے دیے
دل کی تاریک وادی میں روشن کیے
شامِ زنداں میں ، صبحِ طرب سے پرے
زہر کے جام امرت سمجھ کر پیے
میں نے تیرے لیے ، اے نگارِ چمن!
دشت و گلزار کے فاصلے طے کیے

دور تھیں منزلیں ، راہ دشوار تھی
نرغۂ راہ زن میں تھا ایک اک نفَس
کارواں سخت معذور و مجبور تھا
اور خاموش تھی ہر صدائے جرس
اک جمودِ مسلسل تھا ہر ہر قدم
اور ہر سو فروزاں تھی شمعِ ہوس

یار و اغیار سب طعنہ زن تھے مرے
میں پریشاں تھا تیری طلب میں ، مگر
لاکھ پُر پیچ تھا جادۂ زندگی
پھر بھی روشن تھی قندیلِ عزمِ سفر
اور حقائق کے بے تھاہ گرداب میں
ڈھونڈتی پھر رہی تھی تجھی کو نظر

رفتہ رفتہ ترے پیار کا قافلہ
منزلِ صبحِ نو کے قریب آ گیا
زخمِ کون و مکاں مندمل ہو گئے
لب تبسم سے پھر ہو گئے آشنا

مسکرا ، اے بہارِ چمن ! مسکرا
اک نئے عہدِ زریں کا مژدہ سنا
مسکرا ، اے نگارِ وطن ! مسکرا

کاروانِ پس ماندہ

ستم گزیدہ شعورِ حیات کے انجم
دل و نگاہ کی وادی کو جگمگاتے ہیں
دبی دبی سی امنگوں کی نرم چھاؤں میں
قدم قدم پہ نئے کارواں بناتے رہیں!

یہ کارواں جو شبِ ظلم پھول کی صورت
کبھی خیال بنے ہیں، کبھی خیال کی آس
کبھی سکون کا حاصل، کبھی چراغِ امید
کبھی شکستہ دلی کے سبب اداس اداس
کبھی خرد کی تمنا میں خود سے بیگانہ
کبھی جنوں کے لیے بے نیازِ ہوش و حواس

کہیں خلوصِ مجسم رہے رقیب کے ساتھ
کہیں عدو کے لیئے جسم و جاں گنوا آئے
وصالِ منزلِ فردا کی دُھن میں چار طرف
سَحر کے نام پہ شمعیں کئی جلا آئے
خزاں رسیدہ چمن کی اداس کلیوں کو
مثالِ دستِ صبا چھیڑ کر کھلا آئے

حقوق یافتہ رہبر نے اُن کی راہوں میں
صلیبیں لا کے رکھیں ، اہتمامِ دار کیا
اُنھیں کی فکر نے ہر لحظہ بامِ ثروت پر
امیرِ شہر کو دل گیر و سوگوار کیا
اُنھیں کے عزمِ وفا نے ، نگاہِ آدم نے
زمیں کی چاہ میں عرشِ بریں شکار کیا

الم نصیب یہی کاروانِ پس ماندہ
ہر ایک جادۂ غم پر چراغِ راہ بنیں!
غضب کی آگ بھڑکتی رہے ہر ایک طرف!
سیاہ رات میں لیکن یہ مثلِ ماہ بنیں!
صعوبتوں کے اندھیرے میں جس طرف جائیں
ہم اہلِ دل کی عقیدت بھری نگاہ بنیں!

بیداری

ایک امیدِ نو دمیدہ پر   دل نے کیا کیا نہ حوصلے پائے
کبھی طوفاں میں سر اٹھا کے چلا   کبھی کھائے فریب موجوں کے
کبھی حدِ خلوص تک پہنچا   کبھی گزرا سرابِ ہستی سے

ہر نئے راستے کو اپنایا   ہر نئی رہ گزر سے پیار کیا
ماہ و انجم ہوں یا کہ کاہکشاں   ہر قدم پر اُنھیں شکار کیا

آخرش ارتقا کی منزل پر   قافلۂ زندگی کا آ پہنچا
مُسکرانے لگا شعورِ حیات   آدمِ نو کا ذہن جاگ اٹھا

حادثہ

سب کشتگانِ مہر و محبت گزر گئے
جل کر ہوس کی آگ میں بےموت مر گئے

کیا ارتقا کی منزلِ آخر ہوئی نصیب؟
کن منزلوں کی سمت ہم اہلِ نظر گئے؟

تنظیم و اتحاد و اخوت کے سائے میں
اپنوں کی تیغِ ظلم سے کتنوں کے سر گئے

کتنے چراغ جشنِ چراغاں نے گل کیے
انسانیت کے دور میں انسان مر گئے

فتح

لمحہ لمحہ، ساعت ساعت
انجانی سی خوشبو پھیلی
مہکا سارا شہر
اور گرہن سے نکلا سورج
بحر و بر پر چمکا سورج
دھرتی جاگ اٹھی
ظلمتِ شب کی آہنی چادر
ایک کرن سے ٹوٹ گئی

روح کا سمندر

ایک سیلِ بے پایاں
روح کے سمندر کا
رات کے اندھیروں میں
وقت کے جزیروں میں
روشنی کا دل دادہ
تیرگی میں افتادہ
جانے، کس زمانے سے اور کس زمانے تک

جستجو کی منزل میں
آرزو کے گلشن کی
تازگی پہ زندہ ہے
خواب ناک لمحوں کا جال بُنتا جاتا ہے
روز و شب بدلتے ہیں
ماہ و سال کی صورت
وقت کی فصیلوں سے
کارواں گزرتا ہے
اور سیلِ بے پایاں
روح کے سمندر کا
کرب ناک لمحوں کی داستاں سناتا ہے

منزل

میں تیرگی کے اتھاہ ساگر میں
خود کو محسوس کر رہا ہوں
مری نگاہوں میں آ رہی ہے
نہ جانے کس کے لہو کی سرخی؟
جو روشنی کی لکیر بن کر
قدم قدم پر
مجھے دکھاتی ہے میری منزل

میں ایک تنکے کی طرح بے بس
اندھیرے ساگر میں
جستجو کا عصا سنبھالے
کھڑا ہوا ہوں ــ (کوئی نہیں ہے)
کوئی نہیں ہے جواب صدا دے (مجھے پکارے)
مجھے پکارے
کہ میری منزل قریب تر ہے

آواز

کل بھی اک خواب تھا
آج بھی خواب ہے
کل بھی تھا دجلۂ خوں رواں ہر طرف
آج بھی ہیں لہو رنگ دریا بہت
آج بھی اک طلسمِ شب و روز میں
ہم اسیرِ تگ و تازِ آہنگ میں
کل بھی حرفِ نوا اپنی تقدیر تھا
آج بھی لفظ و معنیٰ کی تکرار ہے

کل کے دستور سے تازہ منشور بھی
کچھ زیادہ ہی سفاک ہے، دوستو!
آج کی بات لیکن بڑی بات ہے
آج سچ کی صدا
دل کی آواز ہے

چھتنار درخت

چھتنار درخت نے کہا تھا
میں دھوپ سے لڑ رہا ہوں پیہم
تم سائے میں آ کے بیٹھ جاؤ
میں سارے عذاب جھیل لوں گا
تم صرف رفاقتیں مجھے دو

چھتنار درخت نے کہا تھا
صدیوں سے جو ظلم یاں روا ہے
میں اُس کا طلسم توڑ دوں گا

دھرتی پہ جو ہل چلا رہا ہے
یہ کھیت اُسی کی ملکیت ہیں
یہ مِل جو دھواں اگل رہا ہے
مزدور کا خون جل رہا ہے
محنت کا صلہ اُنھیں ملے گا
سرمائے کا سر نہ اٹھ سکے گا

چھتنار درخت نے کہا تھا
چھتنار درخت اب کہاں ہے؟
پردے میں بہار کے خزاں ہے
شاخوں سے جدا ہوئے ہیں پتے
تنہا وہ کھڑا یہ سوچتا ہے
بس میرا وجود ہی ہے سب کچھ
بس میں ہی امر ہوں، سب فنا ہے
سو اُس کے ہی دوستوں نے آخر
پھانسی پہ اُسے چڑھا دیا ہے

نوحۂ رفتگاں

مجھ کو ایسا لگا جیسے ماں نے مجھے
وقتِ رخصت پکارا تھا اور میں نہ تھا
مجھ کو ایسا لگا جیسے اک تیر سا
میرے سینے میں پیوست ہو اور مجھے
آہ بھرنے کا بھی آج یارا نہ ہو
مجھ کو ایسا لگا
یہ فصلِ شبِ غم، یہ دیوار و در
میرے مرقد کی دیواریں ہوں، اور میں

وشتِ غربت کے اندھے کنویں میں کہیں
بازگشت اپنی آواز کی سن کے چپ چاپ
بے بس کھڑا
اپنی ویران آنکھوں سے دریا بہانے پہ
مجبور ہوں

قطعات

ہم اسیرانِ طلسمِ تیرگی
ہیں چراغِ کشتۂ اسرارِ شب
دن کو سورج کی تمنا میں جلے
بجھ گئے لیکن پسِ دیوارِ شب

تجھ سے بچھڑے تو بہت دن ہم نے
زندہ رہنے کے بہانے ڈھونڈے
اک حقیقت کو بھلانے کے لیے
ہر حقیقت میں فسانے ڈھونڈے

ہر اک لمحہ ، ہر اک ساعت ، ہر اک پل
مسلسل رنگ اپنے بھر رہی ہے
نمو پایا ہے جس مٹی سے میں نے
وہی مٹی تعاقب کر رہی ہے

اِس دنیا میں کون ہے اپنا ؟ کس کو اپنا کہیے گا؟
نظمی صاحب ! آپ کہاں تک تنہا تنہا رہیے گا؟
جھوٹی باتیں، جھوٹے فقرے، بے معنیٰ، بے جان صدا
دشت کو دریا کہتے رہیے ، دریا کو کیا کہیے گا؟

تھکے تھکے ہوئے چہرے ، رکے رکے ہوئے دل
فسانۂ غمِ حالات کہہ نہیں سکتے
یہ جبر کم تو نہیں ہے کہ ہم اسیرِ سَحر
سیاہ رات کو بھی رات کہہ نہیں سکتے

کوئی صدا ، کوئی ، آواز ، کوئی دل دھڑکے
کہ یہ حصار ، یہ دیوار ٹوٹ کر رہ جائے
کوئی اٹھے تو سہی دل بہ دست ، شعلہ بہ لب
طلسمِ خواب کا پندار ٹوٹ کر رہ جائے

سپر انداز ہے لمحہ لمحہ
اور ہم لوگ کہ پتھر ٹھہرے
کشتیاں پار لگی جاتی ہیں
اک ذرا دیر سمندر ٹھہرے

اب فریبِ مسلسل سے ذہنِ بشر
ہر قدم پر گریزاں نظر آئے گا
اور پھر ، اے خدائے زمان مکاں!
کج کلاہانِ دوراں پہ چھا جائے گا

موج موج تشنگی

موج موج تشنگی

(مجموعۂ کلام)

اصغر مہدی نظمی

ڈاکٹر وزیر آغا

احساسِ زیاں کا شاعر

اداسی کی ایک ہلکی سی لہر اصغر مہدی نظمی کی غزلوں میں رَواں ہے جو گاہے ماہے طنز کی موہوم سی جراحت بن کر ابھرتی اور پھر ہموار ہو جاتی ہے۔ بعض اشعار میں نظمی نے اپنے تجربات کے لطیف پہلوؤں کو ایسے سادہ اور دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اُس کے ہاں ہجرت کا کرب ایک اجڑتے ہوئے شہر کی کرب انگیز فضا میں مل کر جس احساسِ زیاں پر منتج ہوا ہے، اُسے لفظوں کی گرفت میں لینا بہت مشکل تھا، مگر نظمی اُس میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ لفظ و معنیٰ کی اسیری سے بددل اور گفتگو کی آزادروی کا دل دادہ ہے اور اِسی حوالے سے اُسے دوہرے معیاروں آرایش اور تصنع سے چڑ اور سادہ دلی، معصومیت اور سچ بولنے کے عمل سے لگاؤ ہے کہیں کہیں رسن و دار، بارشِ سنگ، انتظارِ سحر، چراغِ آخرِ شب، علاجِ گردشِ دوراں مجرم، میزان اور عدالت ایسے الفاظ اور تراکیب سے یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ ایک خاص مکتبِ شعر کے ڈکشن سے متاثر ہے، مگر مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو وہ زیادہ تر اپنی آواز اور اپنے لہجے ہی میں بات کرتا نظر آتا ہے، اور یہی اصل بات ہے۔

حُسین انجم

اصغر مہدی نظمی

آزادگانِ قیدِ حیات و اسیرانِ بندِ غم، اِن دونوں طرح کے اصحابِ نظر و نقد کی اِس مجموعۂ کلام پر گراں قدر آرا کے بعد جو

معانیش در حرفِ زیرِ سیاہ
درخشندہ چوں مہر، روشن چو ماہ

کے مصداق ہے، میرا کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ کیا ہوگا، اس لیے اصغر مہدی نظمیؔ، جو میرے محترم دوست بھی ہیں، کی خوشنودیِ طبع کی خاطر فقط اِس قطعۂ فارسی پر خاتمۂ کلام کر رہا ہوں جو میں نے اُن کی اُس پُرتکلف دعوت کے لیے کہا تھا جس کا اُنھوں نے کچھ عرصے پہلے اپنے غزل کدے پر سخن سنج و سخن فہم احباب کی تواضع کے لیے اہتمام کیا تھا۔ ایسی دعوتیں وہ گاہے ماہے کیا کرتے ہیں:

بخاطرم ہمہ نعماتِ خوش مزہ آورد
بسیر چشمی و خوش نظمی و اولوالعزمی
برائے شغل بدہ ساقیا بمن ساغر
زِ آں سبو کہ ترا داد مہدیِ نظمیؔ

مظہر جمیلؔ

مشاطگیِ فن اور اصغر مہدی نظمیؔ

جناب اصغر مہدی نظمیؔ کا دوسرا مجموعہء کلام 'موج موج تشنگی' پیشِ نظر ہے۔ اِس سے قبل اُن کا ایک شعری مجموعہ 'خواب ترے خیال کے' کم و بیش گیارہ بارہ سال قبل اشاعت پذیر ہو کر سخن فہموں سے داد حاصل کر چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب گزشتہ عشرے کی شعری کاوشوں کے انتخاب پر مشتمل ہے، اِس طرح دیکھیے تو اصغر مہدی نظمیؔ کے چالیس سالہ ادبی سفر کا حاصلِ اولیٰ طباعت کے مراحل سے گزر کر ادب شناس حلقوں میں باریاب ہے کہ وہ اُن کے جوہرِ تابندہ مثال کو پرکھیں اور اُن کی فکرِ جودت مقال کی نشاں دہی کریں کہ یہی سخن فہمی کا تقاضا اور صحت مند ادبی روایت کے تسلسل کا جواز ہوا کرتا ہے۔ ہر چند اصغر مہدی نظمیؔ کا شمار بسیار گو شعرا میں نہیں ہوتا لیکن یہ بات بھی قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتی کہ اُن کے چالیس سالہ طویل تخلیقی سفر کا حاصل محض یہ دو مختصر مجموعے رہے ہوں گے۔ ظاہر ہے اشاعتی مراحل میں قدم رکھنے سے قبل

اُنھوں نے اپنے شعری سرمایے کو خود احتسابی کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد کڑے انتخاب سے ضرور گزارا ہوگا، ورنہ وہ بھی آج کم از کم نصف درجن شعری کتب کے مصنف قرار پاتے، اِس طرح گویا اُنھوں نے میرؔ کے بجائے غالبؔ کی تقلید کرنا ہی مناسب خیال کیا ہے کہ خود احتسابی اور جارحانہ انتخاب کی پہلی لکیر غالبؔ ہی تو کھینچ گئے ہیں، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ تخلیق کی ترازو میں معیار اور مقدار کے پلڑے کب اور کہاں برابر ہوئے ہیں۔

اصغر مہدی نظمیؔ کے پہلے مجموعۂ کلام 'خواب ترے خیال کے' پر لکھتے ہوئے پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا تھا:

> ''نظمیؔ صاحب واقعی اچھے شاعر ہیں، سلیقے سے شعر کہتے ہیں، صاف کہتے ہیں، مشکل بنا کر اپنے کو منوانے یا پہچنوانے کی کوشش نہیں کرتے اُن کی شاعری بے خبر آدمی کی شاعری نہیں ہے۔ نظمیؔ صاحب راہ کے پیچ و خم اور دشواریوں سے واقف ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حالات بدلتے ہیں اور حالات بدلیں گے۔ جدید ہونے کے چکر میں وہ شعریت سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں، یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔ اُن کی شاعری ہجر کی شاعری ہے، اُس میں یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ سلسلہ مستقبل سے مایوس نہیں، حال سے دُکھی ہے، اس لیے اُن کا درد بے سود نہیں ہے، ایسی شاعری بے رس اور بے رنگ نہیں ہوتی۔ نظمیؔ صاحب کے ہاں یاد رہ جانے والی خصوصیت پائی جاتی ہے، یہ وہ چیز ہے جس کی غیر موجودگی سے بہت سے شہرت یافتہ شاعر بھی اپنی شہرت کھو دیتے ہیں''۔

اِسی طرح پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے فرمایا تھا:

''اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں کی منزل سے نکل کر اُس وجدانی نفسی کیفیت کی ترجمان ہوئی ہے جہاں شعورِ ذات شعورِ غیر کا حامل ہو جاتا ہے، جہاں شاعر اپنے آئینۂ ذات میں دوسروں کی تصویریں بھی دیکھتا ہے، یہاں من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے اور دوسروں کا درد اُس کا اپنا درد بن جاتا ہے:

اپنے غم سے بیگانہ تھا، لیکن یہ معلوم نہ تھا
دنیا کے دُکھ درد میں، نظمیؔ! اپنا غم بھی شامل ہے''

کچھ ایسے ہی خیال کا اظہار اب سے ستائیس سال قبل پروفیسر احتشام حُسین صاحب نے کیا تھا۔ اُنھوں نے اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری کی مجموعی فضا پر لکھتے ہوئے اظہارِ خیال فرمایا تھا:

''آج کے شاعر نے غزل کے اندرونی حُسن کا راز پا لیا ہے۔ وہ اُس پر زیادہ بوجھ ڈالے بغیر معمولی مشاطگی سے اُسے سجا کر حسین بنا دیتا ہے اصغر مہدی نظمیؔ نے بھی اِس اداشناسی کا ثبوت اپنی غزلوں میں دیا ہے کنایے اور استعارے کے ہلکے پھلکے زیوروں سے آراستہ کر کے اُس کی اداؤں کو اور دل نشیں بنا دیا ہے، اپنے جذبے کا گداز سونپ کر اُس میں گرمی اور خیالوں کی رعنائی بخش کر نکھار پیدا کر دیا ہے۔ نظمیؔ کی غزلوں میں درد کی جو ہلکی سی آنچ ہے، وہ میرے دل کو بھی چھوتی ہے، کیونکہ وہ انسانی غم کے احساس سے معمور اور دردِ حیات کی کسک سے جان دار ہے''۔

ادب کے اِن بزرگ و جید ناقدین (جو افسوس! اب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں) کی معتبر آرا کے بعد اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری پر مجھ جیسے ہیچ مداں

کے تبصرے کی گنجایش کہاں رہ جاتی ہے، کہ اِن بزرگوں کی تحریروں سے نہ صرف نطقیؔ کے اندازِ فکر کی نشاں دہی ہو جاتی ہے بلکہ اُن کے طرزِ سخن کا تعارف بھی ہو جاتا ہے اب دیکھنے کی بات یہ رہ جاتی ہے کہ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے جناب نطقیؔ سے جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، اُن کی موجودہ شاعری اُن توقعات کی برآوری میں کہاں تک کامیاب رہی ہے اور وہ کون کون سے مقامات ہیں جہاں تخلیقی جست تکمیلِ پرواز سے پہلے ہی ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔

یوں تو اصغر مہدی نطقیؔ نے نظم و غزل دونوں ہی اصناف میں دادِ سخن دی ہے، اور میں بھی شاعر کو اصناف کے حوالے سے تقسیم کرنے کا قائل نہیں ہوں کہ کسی خاص صنف کا انتخاب دراصل خود تخلیق کے اندرونی مزاج، آہنگ اور اظہار کی فنی ضرورتوں کا مرہونِ منت ہوا کرتا ہے، لیکن اِس کے باوجود اِس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کوئی خاص شاعر اپنے طبعی میلان کے تحت کسی خاص صنفِ سخن میں زیادہ لطف و سرور پاتا ہے اور بالآخر وہی اُس کی شناخت بن جاتی ہے۔ اِس اعتبار سے اصغر مہدی نطقیؔ کی اصل شناخت اُن کی غزلیں ہی ٹھہرتی ہیں، اور غزل جیسی جان لیوا صنفِ سخن میں اپنے مخصوص اندازِ قامت کی شناخت پیدا کر لینا کچھ آسان کام بھی نہیں ہے کہ

ایں سعات بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

غزل جہاں محبوبہ ہزار شیوہ ہے، وہیں وہ جابر و منتقم مزاج عدو بھی ہے کہ اُس سے لاگ اور لگاؤ دونوں ہی کا قرینہ احتیاط اندر احتیاط کا متقاضی ہوا کرتا ہے۔ غزل کے روایتی روابط اور تقاضے اِتنے مستحکم اور مضبوط ہیں کہ اُن سے ذرا بھی غیر محتاط انحراف

تخلیقی سطح پر غزل گو شاعر کی خودکشی پر منتج ہو سکتا ہے، لیکن اِس کے ساتھ ہی غزل تجربے کی ایسی جوئے رَواں بھی ہے جس میں ہر موجِ تازہ نئے امکانات کو جنم دیتی رہتی ہے غزل کی یہی وہ زندگی آموز خصوصیت ہے جس نے عہد بعہد اُس کے جمال کو نکھارا ہے، ورنہ یہ بھی بعض قدیم اصناف کی طرح ٹھہرے ہوئے سڑاند پانی کا جوہڑ بن چکی ہوتی۔ چنانچہ آج کی جدید غزل اپنی لفظیات، معنوی فضابندی اور تاثر آفرینی میں اِتنا کچھ بدل چکی ہے کہ اُسے آپ اُس کی تمام کلاسیکیت کے باوجود عصرِ رَواں کی امین قرار دیتے ہیں اور اِس کے باوصف وہ غزل کے روایتی مزاج کی حریف بھی نہیں ٹھہرتی۔ یہ مشکل منزلیں بھلا کیونکر سر ہو سکتی تھیں اگر مجتہدینِ غزل اپنے اپنے عہد کے حوالے سے غزل کی روایت کو آگے نہ بڑھاتے اور موج در موج تجربے کے موتی نہ رولتے! اصغر مہدی نظمی تک پہنچتے پہنچتے غزل اِس یک رخی تقلید اور پیش پاافتادگی کی یبوست سے نجات پا چکی ہے جس پر جدید شاعری کے اکثر منصب دار تعرض انداز ہوتے رہے ہیں۔ دراصل غزل پر حالی سے لے کر اب تک جتنے بھی اعتراضات وارد ہوئے ہیں، وہ اُس عمومی بھیڑ بھاڑ بلکہ بھیڑ چال کی وجہ سے عائد ہوتے رہے ہیں جو اِس صنفِ سخن کی غیر معمولی مقبولیت اور اُس گوناگوں ناگزیریت کی پیدا کردہ ہے جس کی موجودگی میں ایک اوسط شاعر کو ایجاد و اختراع کی کوئی خاص زحمت نہیں اٹھانی پڑتی قافیے اور ردیف کی پابندیاں دراصل پابندیوں سے کہیں زیادہ تن آسانیوں کا جواز بن جاتی ہیں۔ ڈھلی ڈھلائی لفظیات، ترشی ترشائی تراکیب و محاکات، چبے چبائے مضامین، بنے بنائے مناظر، سمجھی سمجھائی ہوئی رعایتیں اور اُن کی نپی تلی تقلید، یہی تو وہ اعتراضات ہیں جو غزل پر وقتاً فوقتاً عائد ہوتے آئے ہیں، اور اِن میں کون سا اعتراض ایسا ہے جس کی صداقت سے انکار ممکن ہو؟ لیکن اصل میں یہ تصویر کا صرف ایک رخ

ہے، مکمل صورتِ حال نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ آج کی غزل کے مزاج کو سمجھنے کے لیے اُس کی مجموعی فضا کے ساتھ تازہ کاری اور تجربے کے اُن گنگا جمنی دھاروں کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا جانا چاہیے جو عہد بعہد جاری وساری رہتے رہے ہیں کہ اُن کے بغیر آج یہ صنفِ سخن اِس قدر موثر اور دل کش انداز میں پھل پھول نہیں سکتی تھی، لہٰذا آج کے غزل لکھنے والے شاعر سے اگر یہ توقع کی جائے کہ وہ اُس کی صنفی و جمالیاتی ضرورتوں اور کلاسیکی مزاج کی پاس داری کے ساتھ اپنے رنگ و آہنگ کی ترجمانی بھی کرے گا تو شاید یہ توقع کچھ ایسی بے جا بھی نہیں ہوگی۔ اپنے عہد میں سانس لینے اور اپنے عہد کو لکھنے کا مطلب یہ قطعی نہیں ہوتا کہ آپ آج کے بازار کے بھاؤ لکھنے اور تازہ ترین خبرنامے نظم فرمانا شروع کر دیں بلکہ اِس سے مراد محض اُس احساس اور فضا کو رقم کرنا ہوتا ہے جو آپ کی ذات اور شخصیت کا حصہ بن کر آپ کی قوتِ متخیلہ کے ذریعے ظہور پاتی ہے آج زندگی کی روز افزوں ژولیدگی اور پیچیدہ تر ہوتی ہوئی حقیقت غزل گو شاعر سے بھی نسبتاً زیادہ سنجیدہ انہماک اور گہرے فنی التزام کی طلب گار ہے جو تقلیدِ محض کی لکیر پیٹنے سے نہیں بلکہ احساس کی معنویت اور امکانِ خیال کی شعریت کو گرفت میں لینے کی سعیِ مشکور سے حاصل ہوتا ہے۔

معلوم نہیں، اِس آئینے میں اصغر مہدی نظمیؔ کی شاعری کے خدوخال آپ کو کس حد تک روشن نظر آئیں، مجھے تو اُن کے ہاں ایسی وافر مثالیں نظر آئی ہیں جن میں ایک طرف اُن کا عہد سانس لے رہا ہے، اور دوسری طرف غزل کی روایت بھی آگے کی طرف سفر کرتی نظر آتی ہے، گو غیر محسوس طور پر ہی سہی۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

صبح سے شام ہوئی راہ میں بیٹھے بیٹھے
کیا ارادہ نہیں اب لوٹ کے گھر جانے کا؟

یہ جو اک لہر سی اٹھی ہے زمانے بھر میں
میرے اقرار سے ہے یا ترے انکار سے ہے

☆

ایک دیوار اٹھانا سرِ مقتل ہر روز
اور کسی کو پسِ دیوار نہ رہنے دینا

قیمتیں اِتنی بڑھا دینا کہ بے کسبِ کمال
دور تک کوئی خریدار نہ رہنے دینا

☆

فریب خوردۂ وہم و گماں تو ہم بھی ہیں
وہ آسماں ہے تو کیا، آسماں تو ہم بھی ہیں

کسی کا ذکر ہی کیا، خود ہمیں بھی یاد نہیں
کچھ ایسی بھولی ہوئی داستاں تو ہم بھی ہیں

☆

خوں فشاں ہیں دست و بازو، دیدہ و دل اور ہم
مائلِ زیبائشِ رنگِ حنا ہیں مستقل

☆

اِس بستی کے رہنے والے سات سمندر پار گئے
سونا چاندی جیت کے لائے، جسم کا کندن ہار گئے

چھاؤں سہانی چھوڑ کے گھر کی من مانی تاویلوں سے
سر پر جلتا سورج لے کر ہم دریا کے پار گئے

☆

گھر کے آنگن میں لگاؤ تو سہی پھولوں کے پیڑ
خود بخود پھر تتلیوں کو بھی خبر ہو جائے گی

وہ جو باقی ہے دلوں میں قربِ منزل کی لگن
وہ بھی نذرِ اختیارِ رہگزر ہو جائے گی

خاک آئے گا یقیں اِس عالمِ تشکیک میں!
آتی جاتی دھوپ کیسے معتبر ہو جائے گی

کیا کریں گے لوگ تہذیبِ خیال و آگہی
وہ جدھر چاہے گا ، یہ دنیا اُدھر ہو جائے گی

☆

آدمی کے بارے میں آج کے شمارے میں
مبتدا بہت کم ہے اور خبر زیادہ ہے

واہمہ تو یہ بھی ہے ، واہمہ تو وہ بھی تھا
شوق کے گھروندے میں ایک در زیادہ ہے

☆

گزرنے والے جہازوں کی روشنی سے پڑے
بہت چراغ تہِ سطحِ آب روشن ہیں

آپ نے دیکھا ہے، یہاں غزل کی لفظیات ہی نہیں، استعارے اور محاکات بھی تبدیل ہوتی ہوئی فضا کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ شاعری کا مستقل اور بنیادی وظیفہ تو ہمیشہ ہی انسانی الم و نشاط کا اظہار رہا ہے۔ رنج و راحت کی یہ لہریں درونِ ذات سے بھی پیدا ہوتی ہیں، کوچہ و بازار کی عطا و عنایت سے بھی، ہجر و وصال کے موسم مصافِ غزل کے ابدی موسم ہیں، لیکن آج کی غزل میں اِن بنیادی انسانی محسوسات کے دائرے نسبتاً زیادہ پھیل چکے ہیں۔ اب ہجر و فراق کا کسیلا پن شبِ ہجراں کی طوالت اور اُس کے متعلقات میں اظہار نہیں پا سکتا کہ اُس میں بستی کے لوگوں کے ساتھ سمندر پار جانے اور سونے چاندی کے بدلے جسم کے کندن ہار آنے کا بے رحمانہ کرب اور دکھ بھی شامل ہو چکا ہے۔ اصغر مہدی نظمی کی غزلیں لخت لخت اشعار سے مل کر ترتیب پاتی ہیں کہ یہ صنفی ہیئت اور ضرورت کا تقاضا بھی ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو اُن میں رشتۂ فکر کا باریک تار غیر محسوس وحدتِ تاثر پیدا کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے مثلاً یہ غزل ملاحظہ فرمایئے:

عدو ہے اور عدو ہوتے ہوئے بھی
خجل ہے روبرو ہوتے ہوئے بھی

ستارے اور دھنک سب مختلف ہیں
کمالِ رنگ و بو ہوتے ہوئے بھی

فضا بوجھل ہے، سناٹا بہت ہے
مسلسل گفتگو ہوتے ہوئے بھی

وہ صحرا میں اذانوں کی صدائیں
وہ سجدے بے وضو ہوتے ہوئے بھی

وہی جلتے ہوئے خیموں کا منظر
کنارِ آب جو ہوتے ہوئے بھی

یہ کیسے لوگ ہیں ؟ کیوں چپ کھڑے ہیں؟
امیدوں کا لہو ہوتے ہوئے بھی

عجب کیا ہے کہ بازی ہار جائیں
ہم اب کے سرخ رو ہوتے ہوئے بھی

اِس مجموعۂ کلام سے ایسی کئی مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن محدودات بہر حال دامن گیر ہیں۔ نظمی صاحب کی غزل پر اِس سرسری تبصرے کے اختتام سے قبل میں ایک سخن گسترانہ لیکن مخلصانہ تاثر اور اندیشے کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں (جو خدا کرے درست نہ ہو!) جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، نظمی صاحب کا شمار اپنے عہد کے اُن شعرا میں کیا جانا چاہیے جو اپنی راہ آپ نکالنے کا ہنر جانتے ہیں اور جو تقلید سے زیادہ تخلیقی تلاش و جستجو پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک معتبر اور خوش گوار لہجے کی بنا پر اُنھیں اُن کے پہلے مجموعۂ کلام کے وقت ہی ایک ''تازہ کار'' اور ''باخبر'' شاعر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اُن کی شاعری پر بزرگ ناقدین نے جن الفاظ میں اُنھیں دادِ سخن دی تھی ، وہ بجائے خود باعثِ طمانیت ہی نہیں بلکہ قابلِ فخر و مباہات بھی ہے۔ لب و لہجہ کی شگفتگی اور پُر تپاک احساس کی صداقت سے وہ ایک ایسی شعری فضا تخلیق کرنے میں یقیناً کامیاب رہے ہیں جو معتبر بھی ہے اور موثر بھی، لیکن شاعری کی جیسی دل کش اور تازہ دم فضا اُنھوں نے گزشتہ عشروں میں پیدا کر لی ہے، وہ اُن سے مسلسل تخلیقیت ،نت نئی تلاش، جسارت اور تازہ ایجاد و اختراع کا مطالبہ کرتی ہی رہے گی۔ اِس بات کا جائزہ تو ہر شاعر کو ہمیشہ

ہی لیتے رہنا چاہیے کہ کہیں وہ خود اپنی ہی ریشمی آواز کا اسیر تو نہیں ہو چلا ہے، اور کہیں خود اُس کے چھوڑے ہوئے نقوشِ پا بار بار اُس کے قدموں سے لپٹ تو نہیں رہے ہیں کہ ایسی صورت میں تخلیقی سفر محض دائرے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور بس۔ اصغر مہدی نظمی صاحب کے زیرِ نظر مجموعے میں جہاں نمو پذیری کے مثبت شواہد موجود ہیں وہیں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن سے تھکن، اضمحلال اور تکرار کا ناخوش گوار اندیشہ سر اٹھانے لگتا ہے (جو خدا کرے درست نہ ہو!) بعض خیال، مضامین اور اشعار کا ایک ہی طرح بار بار دہرایا جانا کسی مبتدی شاعر کے ہاں تو شاید قابلِ گرفت نہ ہو، لیکن نظمی صاحب جیسے مستحکم شاعر کے لیے لمحۂ فکریہ ضرور ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے اِس صورتِ حال سے گریز صرف اُسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب خیال و اظہار میں تنوع اور وسعت کی راہیں کھلی رکھی جائیں۔ اِس حقیقت کو نظمی صاحب سے بہتر بھلا کون جانتا ہوگا!

علی حیدر ملک

بے ساختہ صناعی کا شاعر

ہم ایک عجیب پُر آشوب دور میں جی رہے ہیں۔ پُر آشوب اِس لحاظ سے نہیں کہ ہمیں مسائل و مصائب کا سامنا ہے، انسان اور انسانی زندگی کو مسائل و مصائب کا سامنا تو ہر عہد میں رہا ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔ یہ مصائب اور مسائل تو صرف اُس وقت ختم ہوں گے جب زندگی اور دنیا ختم ہوگی۔ آج کے عہد کو میں نے پُر آشوب اِس اعتبار سے کہا ہے کہ انسانی فطرت کے تضادات، آدمی کے اندر کا کھوکھلا پن اور اُس کی سطحیت بہت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ ہر چیز مسخ ہو رہی ہے، ہر شے زوال کی زد میں ہے۔ اِس کی توجیہ و توضیح خواہ کچھ بھی کی جائے لیکن یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ جب تک خدا پر بھروسا تھا تو انسان پر بھروسا بھی برقرار تھا، جب سے خدا پر یقین کمزور ہوا ہے انسان کا اعتبار اٹھتا جا رہا ہے۔

الہامی کتابوں کا سلسلہ بند ہو گیا تو زمین پر لکھی جانے والی کتابیں ہی انسان کا آسرا اور انسانیت کا مستقبل تھیں، لیکن اب زمین پر لکھے جانے والے حرف بھی

بے توقیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف جہاں مادیت اور مفاد پرستی نے ہر مقدس اور محترم چیز کو گھٹیا اور آبرو باختہ بنا دیا ہے، وہیں دوسری طرف خود اہلِ حرف نے بھی کچھ کم ستم نہیں ڈھائے ہیں۔ ادیب اور شاعر کو معاشرے کی آنکھ اور اُس کا ضمیر سمجھا جاتا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ آنکھ بینائی سے محروم ہو گئی ہے اور ضمیر خوابِ بے حسی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ لوگ جھوٹ لکھتے ہیں اور جھوٹ ہی پروا کرتے ہیں۔ شہرت پسندی ہماری تخلیقی قوت کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے، میڈیا کی چکا چوند نے باطن کی روشنی کو کجلا دیا ہے، سنجیدہ عمل نے مضحک صورت اختیار کر لی ہے۔ ہم وہ کر رہے ہیں جس کا نتیجہ فوراً ہمارے سامنے آئے اور ہماری جھوٹی انا کی جھوٹی تسکین کا باعث بن سکے لوگ اپنی زندگی میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو اُن کی موت کے بعد دوسروں کو کرنا چاہیے تھا ادیب و شاعر اپنے بارے میں فرمائشی مضامین لکھوا رہے ہیں، رسالوں کے گوشے اور نمبر نکلوا رہے ہیں، اپنے اوپر کتابیں تصنیف و تالیف کروا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ معلوم کرنا کہ کون اصلی شاعر ہے اور کون نقلی، کون بڑا شاعر ہے اور کون چھوٹا، بے حد دشوار امر ہے۔ کسی نقاد میں یہ صلاحیت یا جرأت نہیں کہ وہ ذاتی تعلقات اور مصنوعی و غیر ادبی شہرت کے غبار سے اوپر اٹھ کر فن پارے کی بنیاد پر بے لاگ فیصلے کر سکے۔

محبوب خزاںؔ نے جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اپنے ایک مضمون 'مگر سچ کون بولے گا؟' میں لکھا تھا:

> ''ہماری شاعری اگر اِس دور میں چار قدم آگے بڑھی ہے تو ہماری تنقید اور ہمارے اداروں کے باوجود آگے بڑھی ہے۔ جو لوگ شعر کا کام جانتے ہیں اُن کو یا تو زندگی کے دوسرے بکھیڑوں سے فرصت نہیں ملتی یا اُن کے ہاتھ میں قلم نہیں ہے اور جن کے ہاتھ میں قلم ہے اُن کی طبیعت

میں انصاف نہیں ہے۔ اچھا شعر وہ ہے جو اچھے لوگوں کو اچھا لگے، مگر اچھے لوگ کون ہیں اور کہاں ہیں؟"

اِسی مضمون میں آگے چل کر اُنھوں نے لکھا تھا:

"مگر سوال یہ ہے کہ سچ کون بولے گا، سچ کیا ہے اور سچ بولنے کی ضرورت کیا ہے۔ کچھ لوگ پانی سے لکھتے ہیں، کچھ رنگ سے لکھتے ہیں کچھ پسینے سے لکھتے ہیں، کچھ تیزاب سے لکھتے ہیں۔ منزلِ خامہ اگر شہرت انتقام یا دل آزاری نہیں ہے تو جراحت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہے"۔

مگر محبوب خزاں کے اِس مضمون پر تین دہائیاں گزر چکی ہیں اور اب وہ خود بھی خاموش ہیں اور اِس کے بعد صورتِ حال مزید خراب ہوئی ہے، بہتر نہیں ہوئی اور نہ اِس کی کوئی امید نظر آتی ہے۔

اصغر مہدی نظمی بھی شاعر ہیں، مگر وہ صرف اپنی افتادِ طبع اور فطری تخلیقی صلاحیت کی بنا پر شاعر ہیں، کسی گروہ، کسی انجمن یا کسی نقاد نے اُنھیں شاعر نہیں بنایا۔ اُنھوں نے نہ تو میڈیا کو استعمال کیا اور نہ تعلقاتِ عامہ سے کام لیا، مشاعروں میں شرکت کا بھی اُنھیں چسکا یا ہوکا نہیں ہے۔ ذرائعِ ابلاغ اُن کی طرف سے بے خبر اور وہ ذرائعِ ابلاغ کی طرف سے بے پروا ہیں۔ اُن کا پہلا مجموعہ 'خواب ترے خیال کے' ۱۹۸۲ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اب ایک ُیگ یعنی بارہ سال کے بعد دوسرا مجموعۂ کلام اشاعت پذیر ہو رہا ہے اِس میں بھی پہلے مجموعے کی طرح غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں، غزلیں زیادہ اور نظمیں کم۔ پہلے مجموعے میں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۱ء کا کلام شامل تھا۔ دوسرا مجموعہ اُس کے بعد کے کلام پر مشتمل ہے جس میں چند تخلیقات پہلے مجموعے کی بھی شریک ہیں۔

ہمارے عہد کا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص جھوٹ کو اپنی طاقت اور مصلحت کو اپنا ہنر تصور کرتا ہے سیاست داں مفاد پرست اور لاغی ہیں، فن کار سستی اور جھوٹی شہرت کی ہوس میں مبتلا نظر آتے ہیں، نقاد ناحق کو حق ثابت کرنے کے لیے کوشاں دکھائی دیتے ہیں، محقق افترا پردازی اور افواہ سازی میں مصروف ہیں، مورخ عین نگاہوں کے سامنے ڈنڈی مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ایسے میں حق پسند اور سچ بولنے والے کیا کریں؟ اصغر مہدی نظمی حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کم سے کم معیار یہ بتاتے ہیں کہ

سبھی جب مصلحت اندیش ہو جائیں تو بستی میں
کسی سچ بولنے والے کو بے توقیر مت کرنا

یہ عہد عہدِ بے خبری نہیں، عہدِ بدخبری ہے۔ جو بھی نئی خبر آتی ہے، وہ انسان کو اور زیادہ ملول اور دل گرفتہ کر دیتی ہے:

بہت آزردہ خاطر ہوں کئی دن سے، نہ جانے کیوں
کسی تازہ خبر سے اور کچھ دل گیر مت کرنا

ہم زمانے بھر کی باتیں رقم کرتے ہیں اور اگر رقم نہیں کرتے تو اپنی باتیں، اپنے گھر کی باتیں، اپنے وطن کی باتیں:

زمانے بھر کی باتیں داستاں در داستاں لکھنا
کچھ اپنے گھر کے بارے میں کبھی تحریر مت کرنا

یہ ایک ہی منزل کے اشعار ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کی صرف دو آنکھیں ہی نہیں بلکہ تیسری آنکھ بھی کھُلی ہوئی ہے۔

انسان ہمیشہ مستقبل کا تعاقب کرتا رہتا ہے اور ماضی انسان کے تعاقب میں رہتا ہے۔ حال یا لمحۂ موجود بعض فلسفیوں کی نظر میں یا تو وجود ہی نہیں رکھتا اور اگر رکھتا ہے تو ماضی یا مستقبل ہی کے حوالے سے رکھتا ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو اصغر مہدی نظمی کی شاعری ماضی اور مستقبل ہی سے بحث کرتی ہے، ماضی سے کم اور مستقبل سے زیادہ، اور وہ ماضی کو یاد بھی کرتے ہیں تو مستقبل ہی کے حوالے سے یاد کرتے ہیں:

بویا جو بزرگوں نے ، وہی کاٹ رہے ہیں
اب تک مرے بچوں کا مقدر نہیں بدلا

مستقبل کی فکر انسان کو کس کس زاویے سے پریشان کرتی ہے، اِس کی چند جھلکیاں دیکھیے:

نظر میں وسعتِ کون و مکاں رہے کہ یہاں
زمین تنگ نہیں ، تنگ ہو بھی سکتی ہے

دنیا کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اور زمانے کے سرد و گرم سہتے سہتے آدمی اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے دل سے ہر طرح کا خوف نکل جاتا ہے اور وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے، پھر بھی وہ فکر و تردد سے دامن نہیں چھڑا پاتا اِس مرحلے میں اُسے اپنی نہیں، اپنے بچوں کی فکر ستانے لگتی ہے، بچے جو اُس کا اور اِس دنیا کا مستقبل ہیں۔ دیکھیے، اِس خیال کو نظمی صاحب نے کس جاذبیت کے ساتھ پیش کیا ہے:

مجھے تو خوف زیاں ہے نہ خوف جاں ہے مگر
سلگتی ریت پہ کچھ نونہال میرے ہیں

اصغر مہدی نظمی کی شعری دنیا میں اور بھی کئی موسم نظر آتے ہیں۔ میں نے اختصار کے ساتھ صرف اُن موسموں کی طرف اشارے کیے ہیں جو زیادہ دیرپا معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ نظمی صاحب اصطلاحی معنوں میں ترقی پسند ہیں، مگر وہ روایتی ترقی پسند ہرگز نہیں ہیں، اسی لیے اُن کی فکر کسی موڑ پر ٹھہری نہیں بلکہ حالات و تجربات کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتی رہی ہے۔ بحیثیتِ شاعر اُن کی خوبی یہ ہے کہ اُن کے نظریات شعر کی سطح پر نظر نہیں آتے۔ اُن کے نظریات کو آپ اُن کے کلام کے گہرے اور بغور مطالعے کے بعد اُس کے اندر سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اظہار کے معاملے میں وہ خاص لفظوں، خاص ترکیبوں یا خاص بحروں کے اسیر نظر نہیں آتے وہ اپنے خیالات و احساسات کو شعری پیکر عطا کرنے کا ہنر جانتے ہیں اور اِس سلسلے میں ایسی صناعی سے کام لیتے ہیں جو کہیں بھی سادگی کو متاثر یا بے ساختگی کو مجروح نہیں کرتی۔

مختصر یہ کہ اصغر مہدی نظمی بڑے شاعر نہ سہی لیکن ایک سچے اور اچھے شاعر ضرور ہیں، اور اچھا اور سچا شاعر ہونا بجائے خود ایک بڑی بات ہے۔

مسلم شمیم

سلیقۂ عرضِ ہنر کا شاعر

کیا شجرۂ حالات رقم کیجیے ، نظمی!
اک عمر سے ہم سب یہاں بے نام و نسب ہیں

جناب اصغر مہدی نظمی کی شاعرانہ زندگی کا آغاز برِ صغیر کی تاریخ کے ایک اہم سال ۱۹۴۷ء سے ہوا ہے، گویا اُن کی شاعری کی عمر اور پاکستان کے قیام کی عمر برابر ہے اور جو کچھ ہماری قومی زندگی پر بیتا ہے اُس کی صدائے بازگشت اُن کی شاعری میں سنی جا سکتی ہے اور جو کچھ ہمارے سماج پر گزرا ہے اُس کی داستان اُن کے یہاں اشاروں اور کنایوں کی زبان میں پڑھی جا سکتی ہے اور قلم قبیلے کو جن حادثات و سانحات سے دوچار ہونا پڑا ہے اُن سے نظمی بھی دامن کشاں نہیں رہ سکے اور اِن سب کا تخلیقی اظہار کسی نہ کسی شکل میں اُن کے یہاں پایا جاتا ہے۔ وہ روح کے کرب کو اپنے اندر جذب کرتے رہے ہیں اور اُنھیں اپنے اوپر بیتنے والی وارداتوں کی صورت دیگر شعری قالب

میں ڈھالتے رہے ہیں۔ اُن کے دل کی دنیا میں گونجنے والی آوازوں میں غمِ جاں غمِ جاناں اور غمِ جہاں کی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کے ذاتی دُکھوں کے اظہار پر اجتماعی دُکھوں کی چھاپ صاف نظر آتی ہے:

دنیا کے دُکھ وسیلۂ اظہار بن گئے
جب سے مجھے سلیقۂ عرضِ ہنر ملا

یہ سب کچھ شعر کے مخصوص لب ولہجہ میں اُنھوں نے کہنے اور بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اور وہ کہیں بھی شعری جمالیات کو نظر انداز کر کے بلند آہنگی اور تندو تیز لہجے کے وقتی سحر اور مقبولیت کے دام میں نہیں پھنسے۔ اُن کی شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک کی شاعری میں کہیں بلند آہنگی اور تندی و تیزی نظر نہیں آتی، یہی وجہ ہے کہ اُن کے لہجے کا دھیما پن اُن کی شاعری میں جاری و ساری اثر آفرینی کا سرچشمہ ٹھہرتا ہے:

نظمیؔ! نشاطِ دیدہ و دل کی کہانیاں
ہم کشتگانِ کوچۂ آلام کیا کہیں

جناب اصغر مہدی نظمیؔ کے شعری مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، مگر میری رائے میں وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اُن کی غزلوں میں مختلف کیفیات اور لہریں پائی جاتی ہیں، مگر کہیں یاسیت اور افسردگی کا عنصر غالب نظر نہیں آتا، گو اُن کی غزلوں میں دردِ مہجوری اور سوز و اثر ہے جو غزل کا وصفِ خاص کہا جاتا ہے۔
نظمیؔ ہم عصر زندگی کے نامساعد حالات سے دوچار ہوئے ہیں تو اُنھوں نے اُن نامساعد حالات کا سامنا کیا اور اپنے اندر اُن سے نمٹنے کی توانائی پیدا کی۔ وہ مصائب و

آلام سے کبھی گھبرائے نہیں بلکہ اُن سے نبرد آزما ہوئے اور مشکلات و مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے رہے ہیں۔ یہ جہد وسعی اُن کی فکر و احساس سے گزر کر اُن کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اُن کی فطرت میں خودداری اور عزتِ نفس کی پاس داری ہے۔ اُن کا سوز و غم سماجی حالات کی دین ہے۔ اُنھوں نے غزل کی قدیم روایت کو جدید آہنگ دیا ہے۔ وہ روایت کے علم بردار ہونے کے باوجود نئے رجحانات کا خیر مقدم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں روایت سے بغاوت نہیں ہے، مگر نئے تجربات کے لیے اُن کے ذہن و دل کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلیہ شاعری ردیف، قافیہ، صنائع و بدائع اور محاورہ بندی کی شاعری نہیں ہے، ہر چند کہ نظمی صاحب نے فنی لوازم کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ اُنھوں نے غزل کی صنف میں موضوعات اور اندازِ بیاں دونوں اعتبار سے وسعت پیدا کی ہے رومانوی رنگ کے ساتھ زندگی کے حقائق کا بیان انھوں نے کچھ اِس طرح کیا ہے کہ اُن کی غزلوں میں گیرائی اور گہرائی آئی ہے۔ اُنھوں اپنی بساط کے مطابق معاشرت حُسن و عشق، اجتماعی و انفرادی زندگی اور تہذیب کے مسائل کو غزل میں ایسی جگہ دی کہ اُن کے قاری کا ذہن اِس طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کی غزلوں کی ایک خصوصیت جس نے مجھے متاثر کیا، وہ جذبہ و فکر کی ہم آہنگی ہے۔ یہ کہنا بھی نادرست نہیں ہوگا کہ نظمی کی غزل غنائیت لیے ہوئے ہے اور رومان و حقیقت کا سنگم ہے، چنانچہ اُن کی غزلوں میں احساس کی شدت، جذبات کا خلوص اور شعور کی گہرائی کا جگہ جگہ مظاہرہ ملتا ہے۔

جناب اصغر مہدی نظمی کی شاعری میں زندگی تمام تر تہ داریوں اور ہمہ گیریت کے ساتھ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ زندگی اُن کے یہاں حقیقی زندگی ہے جس میں

مسرتیں بھی ہیں اور امکانات کی نئی جہتیں بھی۔ وہ زندگی کی منفی قدروں سے گریزاں اور مثبت قدروں کی قدر کرنے والے شاعر ہیں۔ وہ اپنے قاری کو خوش فہمیوں کی جنت میں نہیں رکھتے، مگر وہ زندگی سے بیزاری کی تلقین بھی نہیں کرتے اور نہ یاسیت اور مایوسیوں کی تاریکیوں میں اُسے ڈھکیلتے ہیں۔ وہ زندگی کے سفر میں درپیش نشیب وفراز کا ادراک رکھتے ہیں اور مسائل ومشکلات جو زندگی کے لوازم میں شامل ہیں، اُن سے نبرد آزما ہونے کی امنگ اور حوصلہ بیدار کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں اپنی بات زیادہ وضاحت وصراحت سے اپنے قاری تک پہنچانے اور اثباتیت کی تصویر کو روشن تر کرنے کی کوشش میں اُن کی شاعری میں بیانیہ اظہار آ گیا ہے، مگر یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر نہیں ہوا ہے بلکہ یہ اصغر مہدی نظمی کے شعری رویوں سے ہم آہنگ ہے۔ وہ شاعری نہ تو محض تفننِ طبع کے لیے کرتے ہیں اور نہ اپنے آپ کو خوش کرنے کے لیے محض اظہار بھی اُن کا مسئلہ نہیں ہے۔ اُن کے یہاں ابلاغ کی بڑی بلکہ کلیدی اہمیت ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں، دوسروں تک پہنچانے کے لیے کہتے ہیں، محض اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شعر نہیں کہتے۔ اُنھوں نے کربِ ذات کی وہ چادر کبھی نہیں اوڑھی جو تنہائی کا رونا رونے والے قلم کار اوڑھ کر اپنی ذات کے خول میں بند اور اپنے اندر سمٹتے جاتے ہیں۔ اصغر مہدی نظمی یہ بخوبی جانتے ہیں کہ انسان سماج پسند جانور ہے۔ سماج سے باہر اُس کا انسانی تشخص قائم نہیں رہ سکتا، اُس کے وجود اور اُس کی شخصیت کی تعمیر و تربیت سماج ہی سے ہوتی ہے۔ یہ اِن حقیقتوں کے ادراک کی دین ہے کہ اصغر مہدی نظمی کے کربِ ذات کے اظہار میں اجتماعی کربِ ذات کی جھلک ملتی ہے اور معاشرہ بیزاری کی نفی ہوتی ہے۔

اصغر مہدی نظمی ادب کو زندگی کا ترجمان بھی جانتے ہیں اور تفسیرِ حیات وتنقیدِ حیات بھی۔ زندگی کی تفہیم ادب کا منصب ہے، وہ یہ نکتہ بھی جانتے ہیں۔ اُن کے یہاں اِس

شعور وادراک کی وجہ سے لایعنیت اور ایسی خود کلامی یا شعور کی رَد جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے، کہیں نظر نہیں آتی۔ شعر گوئی گو اُن کا کُل وقتی مشغلہ اور زندگی کا معمول نہیں ہے مگر اِس کے باوجود اُن کے زندگی اور ادب سے کمٹمنٹ اور وابستگی میں ٹھہراؤ کے ساتھ والہانہ پن ہر جگہ نظر آتا ہے۔ وہ شاعر بنے نہیں ہیں بلکہ وہ شاعر پیدا ہوئے ہیں فطرت نے اُن کی جبلت میں شاعری شامل کر دی ہے۔ شاعری اُن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور اُن کے مزاج میں رچی بسی ہے، یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں در و بست سے زیادہ رواں دواں لہروں کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اُن کے یہاں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا، اِس کے برعکس ایک بے ساختہ پن کا اظہار ملتا ہے، گویا اُن کی شاعری میں آورد سے زیادہ آمد کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ اِن سب عناصرِ ترکیبی نے مل جل کر اُن کے شعری سرمایے کو خاصا متاثر کن اور وقیع بنا دیا ہے۔

اُن کی شاعری میں اگر داخلی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو دراصل یہ اُن کے دلِ دردمند کا قصور ہے، اُن کے سماجی شعور کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ اپنے عہد کی سچائیوں اور حقیقتوں سے آگاہ بھی رہے ہیں اور اُن سچائیوں کو اُنھوں نے بڑی چابک دستی سے شعری قالب بھی عطا کیا ہے۔ وہ تنظیمی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہوں یا نہ رہے ہوں، اُن کی شاعری کے سوتے ترقی پسند تحریک کے سرچشمے سے جڑے ہوئے ہیں اور اُن کے شعری رویوں میں ترقی پسند فکر کی چھاپ واضح ہے۔ وہ ہیئت اور مواد کے درمیان ایک توازن رکھنے کے قائل ہیں۔ اُنھوں نے اپنی نگارشات کو جامع و متوازن اور ادب کے معیارِ جمال سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں ترقی پسند حلقوں میں عالمی حالات میں کلیدی تبدیلیوں کے نتیجے میں جو بحران و انتشار پایا جاتا ہے، اُس سے ہر شخص کسی نہ کسی طور متاثر ضرور ہوا ہے اور اصغر مہدی نظمی بھی اُس

سے مستثنیٰ نہیں رہے، مگر میں یہ بات بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اِن سب کے باوجود ترقی پسندی کے حوالے سے اُن کا لب ولہجہ کبھی معذرت خواہانہ نظر نہیں آیا اور اُن کے قدم کبھی نہیں لڑکھڑائے۔ روحِ عصر کے تقاضوں اور عصری صداقتوں کا وہ ادراک ہی نہیں رکھتے بلکہ اُن کی نگارشات میں اُن کا برملا اعتراف اور اظہار ملتا ہے اور اُن کے نظامِ فکر میں مرکزی نکتہ ٹھہرتا ہے۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ انسانی تہذیب وتمدن جس قانونِ ارتقا کا پابند ہے، وہ وقتی بحرانوں کے سبب سست رَو تو ہو سکتا ہے، رک نہیں سکتا۔ جمود وسکوت ارتقائی عمل کا حصہ نہیں بنتے، لہٰذا معاشرہ جمود و سکوت میں محصور نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح انسانی شعور کا سفر ہمیشہ جاری وساری رہتا ہے اور یہ سفر ہمیشہ پیش رفت کا سفر ہوتا ہے۔ اصغر مہدی نظمی اِن صداقتوں سے آگاہ ہیں اور اُن کی رجائیت اِنھی سے عبارت ہے۔

عام طور پر تقریظ یا پیش لفظ لکھتے ہوئے بیش تر اربابِ قلم مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں اور اپنے ممدوح کے بارے میں ایسی اصطلاحات وتوصیفی کلمات کا برملا اظہار کر دیتے ہیں کہ وہ ہجوِ ملیح کی سرحدیں چھونے لگتے ہیں۔ اصغر مہدی نظمی کو ایسی مبالغہ آرائی کی ضرورت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ میں اُنھیں صاحبِ طرز شاعر نہیں کہوں گا اور نہ یہ کہوں گا کہ اُن کا لہجہ بڑا منفرد اور اُن کی شاعری انفرادی شان کی حامل ہے۔ ایسا کہنا اُن کے ساتھ ناانصافی کرنے کے مترادف ہوگا، کیونکہ صاحبِ طرز شاعر ہونا اور اپنی شناخت اور پہچان پیدا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ پوری اردو ادب کی تاریخ میں ایسے شعرا کی فہرس بہت مختصر ہے جنھیں عظیم، صاحبِ طرز اور منفرد حیثیت کا حامل کہا جائے۔ اصغر مہدی نظمی کا تعلق ایک ایسے عہدِ شاعری سے ہے جہاں شعرا کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہے، اور ادب کی یہ کہکشاں سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعرا کی نگارشات

نے تشکیل دی ہے۔ میرے خیال میں کسی شاعر کا اِس کہکشاں میں شامل ہونا بھی کم فخر کی بات نہیں ہے، اور اصغر مہدی نظمیؔ اُس منصب کے مالک شعرا میں شامل ہیں جن کے فن کی تابندگی اِس کہکشاں کے حُسن کا حصہ ہے۔ فیضؔ صاحب نے ''دستِ صبا'' کے ابتدائیے میں لکھا تھا:

> ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اُس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اُس کی بینائی پر ہے۔ اُسے دوسروں کو دِکھانا اُس کی فنی دسترس پر، اُس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اُس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں''۔

اصغر مہدی نظمیؔ اُس بینائی کے مالک ہیں جو مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کے مشاہدے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ فیضؔ صاحب نے مزید یہ لکھا تھا کہ حیاتِ انسانی کی اجتماعی جد و جہد کا ادراک اور اُس جد و جہد میں حسبِ توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں، فن کا بھی تقاضا ہے۔ فن اِس زندگی کا ایک جزو اور فنی جد و جہد اِس جد و جہد کا ایک پہلو ہے۔ اصغر مہدی نظمیؔ اُن رموز و نکات سے بخوبی باخبر ہیں جن کا اِس اقتباس میں حوالہ دیا گیا ہے اور اُنھوں نے اپنے طور پر اُنھیں اپنی شاعری اور فن میں برتنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

احمد صغیر صدیقی

اصغر مہدی نظمیؔ ۔ ایک تعارف

بھائی اصغر مہدی نظمیؔ میرے مرحوم دوست ساغر مہدی کے بڑے بھائی ہیں جو ہندوستان کے ابھرتے ہوئے شاعروں میں سے ایک تھا اور جس کی ناوقت موت سے یقیناً ایک اچھا شاعر چِھن گیا۔ اُس کے شعری قد وقامت کا اندازہ آپ اُن کے اِن اشعار سے کر سکتے ہیں:

کسی سے بھیک نہ مانگی فقیر کی صورت
کلاہ کج ہی رہی میری میرؔ کی صورت

☆

گلابریدہ سبھی ہیں ، مگر زہے ! توقیر
بلند نوکِ سناں پر یہ سر اکیلا ہے

اِس حوالے سے اصغر بھائی میرے لیے محترم بھی ہیں اور عزیز بھی۔ اُن کی یہ فرمایش کہ میں اُن کے کلام پر کچھ اظہار خیال کروں، میرے لیے اُن کی محبتوں کی غماز ہے اور بس۔

اصغر مہدی بہت عرصے سے لیلائے شعروسخن کی سمت مائل رہے ہیں۔ اُن کے کلام میں جو پختگی اور رچاؤ ہے، اُسے بآسانی دیکھا جاسکتا ہے، لیکن صرف پختگی ہی اچھی اور بڑی شاعری کا وصف نہیں ہوتی، کچھ اور بھی درکار ہوتا ہے اِس کے لیے۔ اصغر بھائی کی شاعری اِس "کچھ اور" کے تجسس سے آپ کو خالی نہیں ملے گی۔ اِس وقت شعرائے کرام کا ہجوم سامنے کی بات ہے اور اُن کی لائن یہاں سے لے کر قطبِ شمالی و جنوبی تک دیکھی جاسکتی ہے۔ اِس شاعری کے بحرِ زخار میں کیا چیز اچھی ہے اور کیا خراب، اِس پر رائے زنی کارِ عبث ہے۔ کلامِ شاعر خود ہی اپنا وکیل ہوتا ہے، یہ رائیں وائیں سب بے کار باتیں ہیں۔ میں اگر چاہوں تو آج کے معروف دیباچہ نگاروں اور مصلحت کوش منافق نقادوں کے مانند منہ دیکھے کی باتیں کرتے کرتے محدب شیشے کی مدد سے اُن کے اشعار میں زبردستی ایسی بہت سی خوبیاں ڈھونڈ کر دکھا سکتا ہوں جو میرؔ و غالبؔ کے ہاں بھی شاید نہ ہوں، لیکن اِس حرکت سے ہوگا کیا؟ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ اِس مجموعۂ کلام کا مطالعہ آپ کو آج کے بہت سے دوسرے شعرا کے شعری مجموعوں کے مقابلے میں (جن کی مدح میں موقع پرست نقادوں نے درجنوں صفحات سیاہ کر رکھے ہیں) اِتنا مایوس نہیں کرے گا۔ اصغر بھائی کے ہاں یقیناً آپ کو بہت سے ایسے اشعار ملیں گے جنھیں پڑھ کر دل و دماغ کو وہی مسرت حاصل ہوگی جس کی توقع کسی بھی دور کی اچھی شاعری سے کی جاسکتی ہے۔ مثلاً اُن کے یہ چند اشعار دیکھیے:

زمانے بھر کی باتیں داستاں در داستاں لکھنا
کچھ اپنے گھر کے بارے میں کبھی تحریر مت کرنا

جب کہیں لوٹ کے آنا ہے نہ جانا ہے تو پھر
لوگ کیوں سوچتے رہتے ہیں سفر کرنا ہے؟

☆

بجا کہ روز کا معمول ہے یہ بارشِ سنگ
تو کیا ضرور کہ شیشے کا گھر نہ رکھا جائے؟

اصغر مہدی نظمی

حرفے چند

’خواب ترے خیال کے‘ نام سے میرا ایک مجموعۂ کلام ۱۹۴۸ء تا ۱۹۸۰ء کے زمانے کے کلام پر مشتمل چھپ چکا ہے۔ میری شاعری کے دوران میں خاصے طویل وقفے رہے ہیں جن کا سبب کچھ تو گردشِ دوراں اور کچھ کم گوئی کے علاوہ اِدھر تقریباً دس سال سے سانس کی بیماری اور دل کے عارضے کی تکالیف رہی ہیں۔

یہ مجموعہ ’موجِ موجِ تشنگی‘ آپ کے سامنے ہے۔ کیسی شاعری ہے یہ، اِس کا کچھ پتا تو مجھے بھی ہے۔ یہ ایک کوشش ہے دل کی باتیں کہنے کی، اپنے محسوسات کے اظہار کی، اور یہ کوشش ہر کوئی اور اپنے طور پر کرتا ہے، کوئی بڑی عمدگی سے یہ مرحلہ سر کرتا ہے کسی کے یہاں وہ سلیقہ نہیں ہوتا، سو میں بھی اِس سے مبرا نہیں، تاہم اِتنی کوشش میری ضرور رہی ہے کہ پڑھنے والے کو چونکا نہ سکوں، سرشار نہ کر سکوں، متاثر نہ کر سکوں تو کم از کم بور نہ کروں، بیزار نہ کروں۔ میں اِتنا خوش فہم بھی نہیں کہ اپنی شاعری کو بڑی

شاعری قرار دوں یا اپنے نام کے ساتھ جدید حسیت کا شاعر، انقلابی اور اجتہادی غزل گو وغیرہ ٹائپ کے لاحقے لگاؤں۔ یہ ضرور ہے کہ روایت کی پاس داری میں نے کی ہے زبان کا خیال رکھا ہے، موجودہ دور کی بدلی ہوئی شکل والی غزل کے حُسن کو حتی المقدور اپنے ہاں سمونے کی سعی کی ہے اور دقیانوسی انداز سے جس قدر اجتناب ہوسکا کیا ہے میرے قارئین اگر یہ تمام باتیں ذہن میں رکھ کر اِس مجموعے کو دیکھیں تو مجھے خوشی ہوگی۔

اِس مجموعے کو منظرِ عام پر لانے میں میرے چند دوستوں کا خاصا ہاتھ رہا ہے اُن میں خصوصیت کے ساتھ احمد صغیر صدیقی اور حُسین انجمؔ صاحب کا ذکر کرنا پسند کروں گا اِن میں کسی نے مقدور بھر مفید مشوروں سے نوازا اور کسی نے حوصلہ افزائی کی۔ اِن کرم فرماؤں کی تشویق و تائید کی بنا پر یہ کتاب طباعت کے مرحلے سے بخیر و خوبی گزری سو میں دونوں حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔

غزلیات

خیالِ صبحِ مسافت ! عذاب کوئی نہ دے
دِکھا وہ خواب کہ تعبیرِ خواب کوئی نہ دے

یہی ہے مشغلۂ جسم و جاں بہت دن سے
سوال کرتا رہوں اور جواب کوئی نہ دے

تمام عمر اِسی کش مکش میں بیت گئی
ثواب بانٹنے والا عذاب کوئی نہ دے

ہیں سب مطالبۂ احتساب پر مائل
مگر دِلوں کے زیاں کا حساب کوئی نہ دے

مسوداتِ جنوں ہی بہت ہیں میرے لیے
مجھے خرد کی مکمل کتاب کوئی نہ دے

مے کدہ غارت ہوا ہے اک سبو کے واسطے
ہم نے کتنا خوں بہایا ہاؤ ہو کے واسطے!

جب سے اہلِ غم ہوئے ہیں لفظ و معنی کے اسیر
ہم ترستے ہیں کسی سے گفتگو کے واسطے

دیکھنا ! کس رخ سے ، کیسا وار اب کرتا ہے کون
ہم حدِ اخلاص رکھتے ہیں عدو کے واسطے

حاجتِ بخیہ گری کچھ میرے دامن کو نہیں
ہیں بہت دامن ابھی باقی رفو کے واسطے

کیا خبر، کس فکر میں غلطاں ہیں اربابِ خرد
ہیں بڑے مضموں جہاں میں جستجو کے واسطے

نظمیؔ! لکھے ہیں قصیدے سب نے اُس کی شان میں
ہم نے لکھی ہے غزل اُس خوب رو کے واسطے

حدیثِ دیدہ و دل کی کبھی تفسیر مت کرنا
مسلسل خواب لکھنا ، خواب کی تعبیر مت کرنا

میں لکھنا چاہتا ہوں جو مرے دل پر گزرتی ہے
مگر الفاظ کہتے ہیں ، ہمیں تحریر مت کرنا

بہت آزردہ خاطر ہوں کئی دن سے نہ جانے کیوں
کسی تازہ خبر سے اور کچھ دل گیر مت کرنا

چلو ! یہ بھی غنیمت ہے کہ تم نے یاد تو رکھا
مگر اِن فاصلوں کو اور تم زنجیر مت کرنا

بھٹکتا پھر رہا ہے کون یہ ساحل پر طوفاں میں؟
ڈبو دینا اِسے ، اے موج ! اب تاخیر مت کرنا

سبھی جب مصلحت اندیش ہو جائیں تو بستی میں
کسی سچ بولنے والے کو بے توقیر مت کرنا

زمانے بھر کی باتیں داستاں در داستاں لکھنا
کچھ اپنے گھر کے بارے میں کبھی تحریر مت کرنا

دل تڑپتا ہے ، مگر دل کو بتاؤں کیسے؟
کوئی رستہ ہی نہیں ، لوٹ کے جاؤں کیسے؟

تم کچھ واقفِ پیرایۂ اظہار بھی ہو
غیر کو رمز و کنایات سکھاؤں کیسے؟

میں اُسے بھول گیا ہوں ، یہ تو دل جانتا ہے
دل کی باتوں کا یقیں اُس کو دلاؤں کیسے؟

میں نے تو پھونک دیا خود ہی نشیمن اپنا
میں کسی اور بسیرے کو بساؤں کیسے؟

شام سے بیٹھا یہی سوچ رہا ہوں چپ چاپ
میں دُکھے دل کا اُسے حال سناؤں کیسے؟

میں تو منزل سے بہت دور نکل آیا ہوں
لوٹ کر آنا بھی چاہوں تو میں آؤں کیسے؟

خود بکھر جاؤں گا اک روز ، یہی ہونا ہے
میں بکھرتے ہوئے لمحوں میں سماؤں کیسے؟

پھول کھلنا ہیں نہ خوشبو کو سفر کرنا ہے
کوئی رُت آئے ، بہر حال بسر کرنا ہے

ڈیرے ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں جہاں مدت سے
اب اُسی کارگہِ ہجر کو گھر کرنا ہے

چھٹ گئیں اپنی روایات بھی اُس شہر کے ساتھ
اب جہاں ہیں ، اِنھیں لوگوں میں بسر کرنا ہے

جب کہیں لوٹ کے آنا ہے ، نہ جانا ہے تو پھر
لوگ کیوں سوچتے رہتے ہیں سفر کرنا ہے؟

کل جو دیوار اٹھائی تھی بڑے شوق کے ساتھ
کیا اُسی آہنی دیوار کو در کرنا ہے؟

ایک اک لفظ کو لکھنا ہے لہو سے ، نظمیؔ!
خونِ دل اور ابھی نذرِ ہنر کرنا ہے

بے رنگ تمناؤں کا منظر نہیں بدلا
دیوار تو بدلی ہے مگر در نہیں بدلا

کچھ سلسلۂ حرف و معانی ہو تو کہنا
لہجہ ترے مکتوب کا یکسر نہیں بدلا

اک تارِ نفس توڑ گیا رات کا جادو
اک شوقِ نظارہ ہے کہ منظر نہیں بدلا

اب تک وہیں بیٹھا ہوں جہاں دھوپ نہ چھاؤں
اب تک مرے احساس کا محور نہیں بدلا

بویا جو بزرگوں نے ، وہی کاٹ رہے ہیں
اب تک مرے بچوں کا مقدر نہیں بدلا

صدائے گل سے ہم آہنگ ہو بھی سکتی ہے
یہ شامِ ہجر شفق رنگ ہو بھی سکتی ہے

ابھی تو امن کی خواہش بھی ہے، ضرورت بھی
پھر اِس کے بعد کبھی جنگ ہو بھی سکتی ہے

نظر میں وسعتِ کون و مکاں رہے کہ یہاں
زمین تنگ نہیں، تنگ ہو بھی سکتی ہے

بھڑک بھی سکتی ہے اک آگ سی چٹانوں سے
لہو کی نہر تہِ سنگ ہو بھی سکتی ہے

وہ کشتِ جاں جسے راس آ گئی ہے ویرانی
تری نگاہ سے گل رنگ ہو بھی سکتی ہے

لکھی ہوئی ہے جو چہروں پہ اک کہانی سی
تمھارے شہر کی فرہنگ ہو بھی سکتی ہے

یہ موجِ بادِ مخالف بھی ایک دن ، نظمیؔ!
جو وہ کہے تو مرے سنگ ہو بھی سکتی ہے

نغمۂ صبح نہ آوازۂ شب ہوتا ہے
دردِ آہنگ بہت سازِ طرب ہوتا ہے

دن تو کٹ جاتا ہے دفتر کی تن آسانی میں
شام ہوتی ہے تو محسوس عجب ہوتا ہے

اُس سے ہم بچھڑے ہیں ایسے کہ سبب ہے نہ جواز
لوگ کہتے ہیں ، بچھڑنے کا سبب ہوتا ہے

ہم تو یہ آخری پتا بھی گرا دیتے ہیں
فیصلہ کھیل کا انجام طلب ہوتا ہے

ٹوٹتا ہے کوئی تارا جو فلک پر سرِ شام
ایک احساسِ گراں باریِ شب ہوتا ہے

ہم کہ رکھتے ہیں الگ اپنی روش ، اپنا چلن
ہم سے ہر دور میں نذرانہ طلب ہوتا ہے

کوئی آسیب در آیا ہے مری بستی میں
روز و شب ایک تماشا سا عجب ہوتا ہے

خطائیں بخشنے والے خطاؤں پر نہیں جاتے
سو ہم بھی نامۂ اعمال اب پڑھ کر نہیں جاتے

گمان و وہم کے در تو بہت کھلتے ہیں ذہنوں میں
مگر ہم دشتِ امکانات سے باہر نہیں جاتے

بہت ہی خوش نما ہیں یہ در و دیوار بھی لیکن
نگاہوں میں بسا رکھے ہیں جو منظر، نہیں جاتے

چلو! اِک تجربہ کرتے ہیں ہم بھی شامِ ہجراں کا
چلو! اِس رات ہم بھی لوٹ کر اب گھر نہیں جاتے

ہمیں معلوم ہے ساری حقیقت ، سارے افسانے
ہم اپنے دوستوں کی خوش بیانی پر نہیں جاتے

مسلسل خوف و دہشت کی فضائیں ہیں ہر اک جانب
کہاں جا کر رہو گے ؟ کس طرف پتھر نہیں جاتے؟

یہ ملنا اور بچھڑنا زندگی میں ہوتا رہتا ہے
بہل جاتے ہیں لوگ آخر بچھڑ کر ، مر نہیں جاتے

طلب کرتی رہیں گی سولیاں ہر روز نذرانے
کہ جب تک دوش پر رکھے ہوئے یہ سر نہیں جاتے

پرندے اُڑتے رہتے ہیں تلاشِ آب میں ، نظمی!
چمکتی ریت کے دل کش سرابوں پر نہیں جاتے

نہ رمزِ عشق ، نہ حُسنِ بیاں لاؤں گا میں
ترے حضور غزل کی زبان لاؤں گا میں

میں توڑ دوں گا یہ سارے طلسم ، سارے حصار
وہی زمین ، وہی آسمان لاؤں گا میں

میں اپنے خواب لیے پھر رہا ہوں آنکھوں میں
سو اب کے نیند کا اک سائبان لاؤں گا میں

تمام تیر اکارت گئے ہیں جنگل میں
جو نیم کش ہو ، اک ایسی کمان لاؤں گا میں

جو تیرا قرب میسر نہیں تو کیا حاصل
اب اور کس کے لیے جسم و جان لاؤں گا میں

جو تہ میں ڈوب گئے ، کیا پتا نشاں اُن کا
شناوروں کے لیے بادبان لاؤں گا میں

جفاگروں سے وفاؤں کی گفتگو ہوگی
محبتوں سے بھری داستان لاؤں گا میں

دیکھے تھے جتنے خواب ، وہ زنجیر ہو گئے
ہم لوگ اپنے عہد کی تصویر ہو گئے

روشن ہوئے تو ساری فضا جگمگا اٹھی
اور جل بجھے تو سرمۂ اکسیر ہو گئے

جو بھی ستم نہ لوحِ جہاں پر رقم ہوئے
وہ سب بیاضِ وقت پہ تحریر ہو گئے

برتیں گے کون لوگ ، کسی کو خبر نہیں
دیوار و در تو خیر سے تعمیر ہو گئے

اب دیکھنا یہ ہے کہ چلے گا کدھر سے تیر
احباب سارے موردِ تقصیر ہو گئے

وہ تھے جہاں پناہ تو ہم بھی تھے بے پناہ
پھر یوں ہوا کہ دونوں پنہ گیر ہو گئے

بارش ہوئی تو سارے شجر جھوم جھوم اٹھے
موجِ ہوا سے دشت بھی تسخیر ہو گئے

نظمیؔ ! علاجِ گردشِ دوراں نہ کر سکے
اہلِ خرد بھی شاکیِ تقدیر ہو گئے

بڑھی جو دھوپ تو سائے کو بے اماں جانے
ہر اک تغیرِ پیہم کو امتحاں جانے

میں ایک پل کے لیے رک گیا جو رستے میں
تو سنگِ راہ مجھے اہلِ کارواں جانے

میں کس حوالے سے ہوں اور کس لیے ہوں یہاں
زمیں تو جان ہی جائے گی ، آسماں جانے

اداس دل نے بہت کچھ کہا سنا ، پھر بھی
اداسیوں کا سبب ہی نہ رفتگاں جانے

غرض کہ ڈوبتی کشتی بچا کے لے آئے
کبھی ستارہ ، کبھی اُس کو باداباں جانے

فرازِ وقت پہ جاں وار دی سلیقے سے
نہ تیرے چاہنے والے ، نہ راز داں جانے

یہ سب جواب تمھارے ، سوال میرے ہیں
اور اِس قدر کہ سبھی حسبِ حال میرے ہیں

بجھا نہ دیں یہ ہوائیں مرے مکاں کے دیے
ڈرے ڈرے ہوئے اہل و عیال میرے ہیں

میں کیسے دست شناسوں پہ اعتبار کروں؟
کہ دسترس میں تری ماہ و سال میرے ہیں

یہ اور بات ، کسی مصلحت سے ہیں خاموش
اگرچہ لوگ بہت ہم خیال میرے ہیں

مسافروں کے لیے سایۂ شجر ہے بہت
تمام برگ و ثمر ڈال ڈال میرے ہیں

کہیں پہ آگ ، کہیں پھول اور کہیں شبنم
تمام روپ ہیں اُس کے ، خیال میرے ہیں

مجھے تو خوفِ زیاں ہے نہ خوفِ جاں ہے مگر
سلگتی ریت پہ کچھ نونہال میرے ہیں

کبھی عدو کو سنبھالا ، دیا کبھی خود کو
مصافِ جاں میں یہی تو کمال میرے ہیں

گھرا ہوا ہوں بظاہر کئی حصاروں میں
کسے خبر ہے کہ یہ سارے جال میرے ہیں

گمان ہی تو ہے ، کچھ بدگمانیاں تو نہیں
کہ سب رفیق یہاں بے مثال میرے لیے

نہیں کہتے یہاں جو سب، اُسے ہم لکھتے رہتے ہیں
فرشتوں کو حریفِ ابنِ آدم لکھتے رہتے ہیں

بنامِ اسمِ اعظم یاد ہیں کچھ لفظ ہم کو بھی
اُنھیں لفظوں کو اُس کے نام پیہم لکھتے رہتے ہیں

بگولے جب بھی لکھیں دشت کے قصے مگر ہم تو
جنونِ وقت کی وحشت کا عالم لکھتے رہتے ہیں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ برسوں کچھ نہیں لکھتے
کبھی لکھنے پہ آتے ہیں تو پیہم لکھتے رہتے ہیں

کسی کی زلفِ پیچاں کو کبھی برہم نہیں کہتے
مسلسل گردشِ دوراں کو برہم لکھتے رہتے ہیں

کہاں کرتے ہیں ذکرِ کج کلاہانِ زمانہ ہم
کسی درویش کی دستار کے خم لکھتے رہتے ہیں

تھا عجب طرفہ تماشا شہر میں!
ہر کنواں اندھا کنواں تھا شہر میں

اپنی گم نامی سے رشتہ توڑ کر
کر لیا ہے خود کو رسوا شہر میں

بند دروازوں پہ دستک کون دے
اس لیے رہتا ہوں تنہا شہر میں

رونقیں گاؤں کی رخصت ہو گئیں
بس گئی ہے ایک دنیا شہر میں

میں نے سب تاریک راتیں کاٹ دیں
چاند اب نکلا ہے کیسا شہر میں

ایک ہی جیسے ہیں سب چہرے یہاں
کون ہے پھر اجنبی سا شہر میں؟

لوٹ جانے کا کوئی رستہ نہیں
گم ہوا ہر آنے والا شہر میں

شام سے پہلے کچھ اندازہ نہ تھا
ہے بہت آشوبِ صحرا شہر میں

ایک بازی میں ٹھکانے لگ گیا
زندگی بھر کا اثاثہ شہر میں

سب لوگ اب کے سال بھی آرام سے رہے
یعنی گھروں میں بند سبھی شام سے رہے

اُس کی طرف نگاہ اٹھائی نہیں گئی
سارے گلے ہمیں دلِ ناکام سے رہے

کچھ بارِ خاطرِ غمِ دوراں ہوئے نہ ہم
کچھ حوصلے بلند ترے نام سے رہے

ہم دل گرفتہ لوگ ہی بیٹھے نہ چین سے
ورنہ تری گلی میں سب آرام سے رہے

آزاد کیا ہوئے کہ بھلا دی اُڑان بھی
سب اجنبی فضا میں تہِ دام سے رہے

اِس عہدِ ناشناس و جہانِ تضاد میں
کچھ نیک نام لوگ ہی بدنام سے رہے

وہ معرکہ پڑا کہ الٹ ہی گئی بساط
پیدل کے ساتھ فیل بھی ناکام سے رہے

جب تک تیر کمان میں ہے
سب کی جان امان میں ہے

کیا بچے اور کیا بوڑھے
جو جس کے امکان میں ہے

سوچ سمجھ کر چلنا ، یارو!
وقت اپنی گردان میں ہے

آندھی ، بارش اور طوفان
غلہ سب کھلیان میں ہے

بند دریچے بند ہی رکھنا!
دھوپ بہت دالان میں ہے

اب کتنے بہروپ بھرو گے؟
ہر چہرہ پہچان میں ہے

کل جو پھول تھا جوڑے میں
آج وہی گلدان میں ہے

ساری قوت ، ساری طاقت
اک توتے کی جان میں ہے

بہت دنوں سے مجھے انتظار اپنا ہے
بہت دنوں سے دل بےقرار اپنا ہے

سوال یہ ہے کہ ہم لوٹ کر کہاں جاتے
سو اب یہ شہر ہی شہرِ نگار اپنا ہے

حکایتِ غمِ سود و زیاں سنیں نہ سنیں
صحیفۂ سخن اعتبار اپنا ہے

وہ جس کے عہدِ رفاقت پہ ناز ہے تجھ کو
وہ تیرا دوست سہی ، پھر بھی یار اپنا ہے

نہ مل سکے جو دوبارہ تو پھر گلہ بھی نہیں
کہ رفتگاں میں تو اب بھی شمار اپنا ہے

بھڑک اٹھا جو ترے ہجر کی تمازت سے
وہی چراغِ شبِ انتظار اپنا ہے

بڑھی جو دھوپ تو کچھ اور بھی گھنیرا ہوا
عجب شجر ہے ! عجب غمگسار اپنا ہے!

ایسی خاموشی نہ تھی ، ایسا بھی سناٹا نہ تھا
بولتے تھے سب در و دیوار ، اندازا نہ تھا

تشنگانِ شوق پھر اک بار دھوکا کھا گئے
ریت کا صحرا تھا وہ ، بہتا ہوا دریا نہ تھا

اُس کے بارے میں بہت کچھ سوچتے تھے روز و شب
اور وہ سوچا ہوا ، سمجھا ہوا لگتا نہ تھا

نیند کے نیلے افق میں بادلوں کے دوش پر
پاس سب کچھ تھا مگر خوابوں کا سرمایا نہ تھا

میں دیکھتا ہوں عجب ہی سماں دریچے میں
کِھلا ہو جیسے کوئی گلستاں دریچے میں

رہا میں جس کے لیے ساری عمر سرگرداں
سما گیا ہے وہی آسماں دریچے میں

ابھی کچھ اور بھی منظر بدلنے والے تھے
کہ ایک شور اٹھا ناگہاں دریچے میں

فصیلِ شہر پہ گل کر دیا ہوا نے جسے
وہی دیا تھا بہت ضوفشاں دریچے میں

کوئی پکار رہا ہے پھر آدھی رات کے بعد
لرز رہا ہے کھنڈر کا سماں دریچے میں

بکھر گئے ہیں بہت دور تک ستارے سے
نظر پڑی تھی بس اک کہکشاں دریچے میں

یہ کس نے نہر کنارے لگا دیے خیمے؟
تڑپ اٹھے سبھی لب تشنگاں دریچے میں

اگر سفر میں کوئی ہم سفر نہ رکھا جائے
تو راہِ زیست کو بھی مختصر نہ رکھا جائے

فرازِ دار سے بھی سربلند رکھنا ہے
جو بارِ دوش ہو ، کاندھے پہ سر نہ رکھا جائے

گزرنے والا ہے اک اور حادثہ کل بھی
جو بے خبر ہیں ، اُنھیں باخبر نہ رکھا جائے

بجا کہ روز کا معمول ہے یہ بارشِ سنگ
تو کیا ضرور کہ شیشے کا گھر نہ رکھا جائے

یوں ہی سپید پھریرے فضا میں لہرائیں
کسی علیم کا نیزے پہ سر نہ رکھا جائے

ہیں دوستوں سے سوا مجھ پہ دشمنوں کے کرم
سوالِ پُرسشِ احوال گر نہ رکھا جائے

دیارِ ہجر میں خانماں خرابوں کو
اسیرِ حلقۂ دیوار و در نہ رکھا جائے

جانے کہاں یہ برہمیِ ذات لے گئی!
جو بھی تھے مجھ میں کشف و کرامات لے گئی

جن کے قریب آ کے سمندر پلٹ گیا
اُن تشنگانِ شوق کو برسات لے گئی

کیا کیجیے گا مےکدۂ ذات کا سفر
نشہ تمام گردشِ حالات لے گئی

لوٹ آئے تھے پہاڑ سا دن کاٹ کر جو لوگ
جانے کہاں اٹھا کے اُنھیں رات لے گئی!

ایسی چلی ہوائے جنونِ جہاں طلب
دل سے خیالِ ارض و سماوات لے گئی

کیا پوچھتے ہو اپنی مسیحائی ؟ صاحبو!
زخموں سے چور چور بدن رات لے گئی

دیکھنا ! ظرف چھلکتے ہوئے پیمانے کا
ایک لمحہ بھی گوارا نہیں مے خانے کا

وقت نے چھیڑا ہے کچھ ایسا فسانہ اب کے
کوئی عنوان ہی ملتا نہیں افسانے کا

صبح سے شام ہوئی راہ میں بیٹھے بیٹھے
کیا ارادہ نہیں اب لوٹ کے گھر جانے کا؟

موسمِ گل میں جنوں اور بھی کچھ تیز ہوا
یہ تو موسم نہیں دیوانے کو سمجھانے کا

دُھن ہے منزل کی کچھ ایسی کہ قدم رکتے نہیں
دھیان بھی آتا نہیں راہ میں ستانے کا

رنج تھوڑا اور خوشی بھی مختصر کر دیجیے
زندگی بھر پھر اِسی عنواں بسر کر دیجیے

آپ اِتنی بات پر کیوں روٹھتے ہیں بےسبب؟
لغزشِ مستانہ ہے ، صرفِ نظر کر دیجیے

اپنے گھر کو آگ دکھلانے سے پہلے ، دوستو!
غیر کو بھی مائلِ رقصِ شرر کر دیجیے

سیرِ ساحل ہو چکی ، اب کودیے منجدھار میں
اور جہانِ آب و گِل زیر و زبر کر دیجیے

اک بہارِ نو کا مژدہ دیجیے ہر پھول کو
پھر ہر اک شاخِ شجر کو بے ثمر کر دیجیے

ایک حرفِ معتبر تحریر کرنے کے لیے
جس قدر بھی ہے لہو ، نذرِ ہنر کر دیجیے

کیا پڑے گا فرق ایمانوں پہ اہلِ شہر کے
اور بھی تعمیر اک مسجد اگر کر دیجیے

دل کو بے لذتِ آزار نہ رہنے دینا
ہے جو رسم و رہِ اغیار ، نہ رہنے دینا

ایک دیوار اٹھانا سرِ مقتل ہر روز
اور کسی کو پسِ دیوار نہ رہنے دینا

قیمتیں اتنی بڑھا دینا کہ بے کسبِ کمال
دور تک کوئی خریدار نہ رہنے دینا

ہم بھی کرتے ہیں بہم جرأتِ تسلیم و رضا
تم بھی باقی کوئی آزار نہ رہنے دینا

ہم نے صحرا کو بھی گلزار بنائے رکھا
تم یہ گلزار بھی گلزار نہ رہنے دینا

خود بھی مٹ جاؤ گے تم اپنے حریفوں کی طرح
دیر تک گرمیِ بازار نہ رہنے دینا

فریب خوردۂ وہم و گماں تو ہم بھی ہیں
وہ آسماں ہے تو کیا ، آسماں تو ہم بھی ہیں

ہمیں بھی رنج بہت ہے بچھڑنے والوں کا
دیارِ ہجر میں بے خانماں تو ہم بھی ہیں

کسی کا ذکر ہی ، کیا خود ہمیں بھی یاد نہیں
کچھ ایسی بھولی ہوئی داستاں تو ہم بھی ہیں

گلہ کسی کو کسی سے نہیں ، مگر پھر بھی
وہ سرگراں ہے تو کیا ، سرگراں تو ہم بھی ہیں

وفا سرشت ہے وہ ، یہ گمان سب کو ہے
یقیں کسی کو نہیں ، بدگماں تو ہم بھی ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ، سننے والوں نے سنا
ہم نے جو تم سے کہا تھا برسبیلِ تذکرہ

جس نے آزادانہ صدیوں کی غلامی بخش دی
وہ عجب حرفِ دعا تھا برسبیلِ تذکرہ!

نام اُس کا بھی شہیدوں میں لکھا ہے ، دیکھنا!
قتل اُس کا بھی ہوا تھا برسبیلِ تذکرہ

بزمِ بےجام و سبو سے کیا ہمارا واسطہ
ذکر اپنا چھڑ گیا تھا برسبیلِ تذکرہ

تم بہت ناراض ہو یا ہم خفا ہیں مستقل
سرحدیں دونوں طرف زنجیرِ پا ہیں مستقل

جس نے تخلیقِ جہاں کی ، اُس خدا کے ماسوا
اِس زمیں پر ہر طرف کتنے خدا ہیں مستقل!

وہ بھی کیا دن تھے کہ اپنے ایک سے آدرش تھے
اور اب دونوں کے رستے ہی جدا ہیں مستقل

اُس نے تو قانون کی حد میں کیے ہیں جرم سب
ہم کہ لاقانونیت کی انتہا ہیں مستقل

معتبر ہیں کون سے خوابوں کی تعبیریں یہاں
بس سہانے خواب ہی اب دیکھنا ہیں مستقل

کیا علاجِ گردشِ دوراں بھی اب ممکن نہیں؟
کیوں عذابِ روز و شب میں مبتلا ہیں مستقل؟

خسروانِ وقت کو راس آ گئی آب و ہوا
اور غریبِ شہر کے دُکھ لادوا ہیں مستقل

خوں فشاں ہیں دست و بازو، دیدہ و دل اور ہم
مائلِ زیبائشِ رنگِ حنا ہیں مستقل

ہجر کا موسم تو تشنہؔ! چار دن کی بات ہے
اِس کی یادیں سلسلہ در سلسلہ ہیں مستقل

عدو ہے اور عدو ہوتے ہوئے بھی
خجل ہے روبرو ہوتے ہوئے بھی

فضا بوجھل ہے ، سناٹا بہت ہے
مسلسل گفتگو ہوتے ہوئے بھی

ستارے اور دھنک سب مختلف ہیں
کمالِ رنگ و بو ہوتے ہوئے بھی

وہ صحرا میں اذانوں کی صدائیں
وہ سجدے بے وضو ہوتے ہوئے بھی

وہی جلتے ہوئے خیموں کا منظر
کنارِ آبِ جُو ہوتے ہوئے بھی

یہ کیسے لوگ ہیں ؟ کیوں چپ کھڑے ہیں؟
امیدوں کا لہو ہوتے ہوئے بھی

عجب کیا ہے کہ بازی ہار جائیں
ہم اَب کے سرخ رو ہوتے ہوئے بھی

ہر طرف چرچے بہت ہیں آج دار و گیر کے
کب سنائی دیں گے آخر زمزمے زنجیر کے؟

اب وہی مجھ سے کرے گا معرکہ آرائیاں
جس کو جوہر دیکھنا ہوں گے مری شمشیر کے

ایک دعوے دار بھی باقی نہیں کیا شہر میں؟
کیا ہمیں وارث ہیں تنہا درد کی جاگیر کے؟

جھانکتا ہے خیمۂ شب سے وہ ماہِ نیم رخ
نقش کچھ ابھرے تو ہیں اک خواب کی تعبیر کے

ختم ہم پر ہی نہ ہوگا یہ جنوں کا سلسلہ
دور تک جائیں گے اب کے سلسلے زنجیر کے

آئینہ خانے میں چہروں کا بدل ممکن نہیں
تم نے کیوں تصویر رکھ دی سامنے تصویر کے؟

شہر میں باقی کوئی صورت بھی ہے ایمان کی؟
چار سُو فتوے ہی فتوے ہیں یہاں تکفیر کے

اِس بستی کے رہنے والے سات سمندر پار گئے
سونا چاندی جیت کے لائے ، جسم کا کندن ہار گئے

یاد نہیں ، کچھ یاد نہیں ، اب کس کو کس کا پُرسا دیں
تنہا بیٹھے سوچ رہے ہیں ، جانے کہاں سب یار گئے!

لائیں کہاں سے ہجر کی دولت ، درد کے تحفے ، دل کے گلاب؟
عشق کا موسم آتے آتے جان سے ہم بیمار گئے

کیا چارہ گری کی بات کریں ، کیا حال کہیں بیماروں کا
جو درد تھا دل میں ، باقی ہے ، سب کہتے ہیں آزار گئے

چھاؤں سہانی چھوڑ کے گھر کی من مانی تاویلوں سے
سر پر جلتا سورج لے کر ہم دریا کے پار گئے

ہم جن پر جان چھڑکتے تھے ، ہر بات پہ جن کی مرتے تھے
وہ لوگ ہی اپنے دشمن تھے ، وہ لوگ ہی ہم کو مار گئے

ہجر و فراق کے دن بھی ، نظمیؔ ! کٹ ہی جاتے آخرِ کار
وقت کی زد پر آ کر لیکن جیتی بازی ہار گئے

نہ لکھے غموں کے نوحے ، نہ خوشی کے گیت گائے
رہِ ہجر کے مسافر شبِ غم گزار آئے

مرے خوش خیال لوگو ! کبھی یوں بھی سوچنا تم
یہاں روشنی ہے جس سے ، وہ چراغ بجھ نہ جائے

کہیں نہر خونِ دل کی ، کہیں تشنگی کے خیمے
بڑے مرحلوں سے ہو کر رہِ کربلا تک آئے

نہ صدائے حرفِ جاں تھی ، نہ وفا کا امتحاں تھا
مگر آگ کا سمندر سبھی پار کر ہی آئے

کہیں پھول چاندنی کے ، کہیں رنگ و بو کے تحفے
ترے ہجر کی دھنک نے بڑے بام و در سجائے

کئی روپ اُس نے دھارے، کئی رنگ اُس نے بدلے
کئی سخت گام آئے ، پہ قدم نہ ڈگمگائے

ہر اک غم میں شریکِ غم رہی ہیں
بہت دن تک یہ آنکھیں نم رہی ہیں

عجب عالم میں گزری ہیں یہ راتیں
کبھی شعلہ ، کبھی شبنم رہی ہیں

اک ایسا رقص جس میں زندگی ہو
کہ نبضیں چلتے چلتے تھم رہی ہیں

گلہ موسم کی بےکیفی کا کیا ہو؟
دلوں میں وحشتیں ہی کم رہی ہیں

کوئی مجرم نہ میزان و عدالت
اصولوں کی جبینیں خم رہی ہیں

ہیں خدشے بھی نئی تنہائیوں کے
پرانی محفلیں بھی جم رہی ہیں

کریں کیا ذکر دل کی قیمتوں کا
کہ مستحکم یہ کم سے کم رہی ہیں

اُنھیں سے مل رہے ہیں زخمِ تازہ
وہ نظریں جو کبھی مرہم رہی ہیں

ثنائے زلفِ برہم کیا کریں ہم
وہ ہر عالم میں اک عالم رہی ہیں

ہمیں نے کی نہیں جن کی وضاحت
وہ باتیں آج تک مبہم رہی ہیں

نہ میرے خواب ، نہ اُس کے گلاب روشن ہیں
وہ تیرگی ہے کہ سارے عذاب روشن ہیں

مرے دُکھوں کے دہکتے ہوئے الاؤ کے ساتھ
تری نگاہِ کرم کے سحاب روشن ہیں

کسی جبیں پہ ستارے چمک رہے ہیں تو کیا!
ہمارے دل میں بھی کچھ ماہتاب روشن ہیں

گزرنے والے جہازوں کی روشنی سے پرے
بہت چراغ تہِ سطحِ آب روشن ہیں

ابھی، خدا کے لیے! مت بجھا نظر کے دیے
ابھی خیال فروزاں ہیں، خواب روشن ہیں

دبی ہوئی ہیں جو چنگاریاں، بھڑک نہ اٹھیں!
کہ دل کے داغ شبِ ماہتاب روشن ہیں

عجب ہے دل کے چمن زار کی یہ کیفیت
کہ زخم زخم ہیں، لیکن گلاب روشن ہیں

زندگی بھر سفر کیا ہے بہت
عمر کو مختصر کیا ہے بہت

توڑ کر سب حصار منزل کے
خود کو بھی دربدر کیا ہے بہت

کیا ہوا صبح کے ستارے کو؟
انتظارِ سحر کیا ہے بہت

جھوٹ کیسا ؟ کہاں کی سچائی؟
ہم نے خود سے حذر کیا ہے بہت

میں کہ معمول ہوں نہ عامل ہوں
میں نے دنیا کو سر کیا ہے بہت

صاحبو ! اب تو صاحبی چھوڑو
غیر نے دل میں گھر کیا ہے بہت

سینچ کر خوں سے کربلا کی زمیں
تشنگی کو شجر کیا ہے بہت

اُس چشمِ تعلق کے اثر میں نہیں رہتا
دل میرا کفِ شعبدہ گر میں نہیں رہتا

اک گوشۂ وحشت میں پڑا رہتا ہے ہر دم
وہ شخص عجب شخص ہے ! گھر میں نہیں رہتا

دل کو لیے پھرتا ہے ہر اک بزمِ خرد میں
سودائے طلب چین سے سر میں نہیں رہتا

کیا چارہ گری کی بات کریں ، کیا حال کہیں بیماروں کا
جو درد تھا دل میں ، باقی ہے ، سب کہتے ہیں آزار گئے

چھاؤں سہانی چھوڑ کے گھر کی من مانی تاویلوں سے
سر پر جلتا سورج لے کر ہم دریا کے پار گئے

ہم جن پر جان چھڑکتے تھے ، ہر بات پہ جن کی مرتے تھے
وہ لوگ ہی اپنے دشمن تھے ، وہ لوگ ہی ہم کو مار گئے

ہجر و فراق کے دن بھی ، نظمؔی ! کٹ ہی جاتے آخرِ کار
وقت کی زد پر آ کر لیکن جیتی بازی ہار گئے

موسم نے اداس کر دیا ہے
کھلتا ہوا زخم بھر دیا ہے

جو میں نے کیا، کہا نہیں تھا
جو اُس نے کہا، وہ کر دیا ہے

اعزازِ صلیب و دار کیسا؟
تھی اُس کی رضا تو سر دیا ہے

مقصود تھا ڈوبنا ، سو ہم کو
دریا نے کنارے کر دیا ہے

صحرا میں ابل پڑے ہیں چشمے
پیاسوں نے کمال کر دیا ہے!

اب اِس کا جواب بھی تم ہی دو
تم نے جو سوال کر دیا ہے

برسوں کی ریاضتوں کا آخر
خوب اُس نے مجھے ثمر دیا ہے

شعلہ سا بھڑک اٹھا ہے دل میں
آنکھوں میں چراغ دھر دیا ہے

رنج تھوڑا سا ، خوشی بھی مختصر ہو جائے گی
اور پھر ہم سے یہ دنیا بےخبر ہو جائے گی

آج پھر تنہا کھڑا ہوں چاہتوں کے دشت میں
آج پھر پاگل ہواؤں کو خبر ہو جائے گی

جب بھڑکتا ہے چراغِ آخرِ شب ، دوستو!
دل یہ کہتا ہے کہ پل بھر میں سحر ہو جائے گی

یوں ہی رک رک کر اگر چلتی رہی نبضِ جہاں
ساری خلقت چارہ ساز و چارہ گر ہو جائے گی

چھوٹے چھوٹے ، ننھے ننھے سے دِییوں کی روشنی
آندھیوں کے سامنے سینہ سپر ہو جائے گی

گھر کے آنگن میں لگاؤ تو سہی پھولوں کے پیڑ
خود بخود پھر تتلیوں کو بھی خبر ہو جائے گی

وہ جو باقی ہے دلوں میں قربِ منزل کی لگن
وہ بھی نذرِ اختیارِ رہ گزر ہو جائے گی

خاک آئے گا یقیں اِس عالمِ تشکیک میں!
آتی جاتی دھوپ کیسے معتبر ہو جائے گی

کیا کریں گے لوگ تہذیبِ خیال و آگہی
وہ جدھر چاہے گا ، یہ دنیا اُدھر ہو جائے گی

کیا کہیں ، نظمیؔ ! مآلِ کاوشِ نقد و نظر
بے سبب برہم صفِ اہلِ ہنر ہو جائے گی

نطق و لب سے ہے نہ کچھ شوخیِ گفتار سے ہے
حرمتِ لفظ تو پیرایۂ و اظہار سے ہے

ہم ہی زنداں میں نہیں عافیتِ جاں کے اسیر
جانے کس کس کا تعلق رسن و دار سے ہے

دشمنی کے بھی کچھ آداب تو ہوتے ہیں مگر
واسطہ اپنا عجب حلقۂ اغیار سے ہے!

یہ جو اک لہر سی اٹھی ہے زمانے بھر میں
میرے اقرار سے ہے یا ترے انکار سے ہے

اُس کی عالی‌نسبی اپنی جگہ ہے ، لیکن
میری قیمت ، میری وقعت مرے کردار سے ہے

دل کو اعلانِ بغاوت نہیں کرنے دیتا
یہ جو اک خوف سا لٹکی ہوئی تلوار سے ہے

آگہی کا سرچشمہ پُرخطر زیادہ ہے
باخبر جو ہے ، وہ بھی بےخبر زیادہ ہے

ہجرتوں کے افسانے ہیں محیط صدیوں پر
قربتوں کا ہر قصہ مختصر زیادہ ہے

آدمی کے بارے میں آج کے شمارے میں
مبتدا بہت کم ہے اور خبر زیادہ ہے

میں کہ اپنے خوابوں کی بستیوں میں رہتا ہوں
مجھ پر خلوتِ جاں کا کچھ اثر زیادہ ہے

واہمہ تو یہ بھی ہے ، واہمہ تو وہ بھی تھا
شوق کے گھروندے میں ایک در زیادہ ہے

اہلِ دل کا شیوہ ہے ، یہ جنون ، یہ وحشت
ہم پہ تہمتِ یاراں سر بہ سر زیادہ ہے

ڈوبنے کی کوشش میں پار لگ گیا ہوں میں
اختیار دریا کا موج بھر زیادہ ہے

اک سماں سا رہتا ہے شور سے پرندوں کے
پیڑ ورنہ آنگن کا بے ثمر زیادہ ہے

فتح کی توقع میں اک عذاب سے گزرے
انحصار اب اپنا ہار پر زیادہ ہے

خامشی سے جاں دیں گے کارِ عشق میں ، نظمیؔ!
یاں ہوس کی باتوں کا شور و شر زیادہ ہے

جب بھی بات چھیڑی ہے شادکام رہنے کی
سعیِ بےسبب کی ہے دل نے رنج سہنے کی

گاؤں گاؤں گھوم آئے ، شہر شہر دیکھ آئے
یہ جگہ نہیں شاید آدمی کے رہنے کی

کوہ اور صحرا میں دور تک نہیں کوئی
اک صدا سی آتی ہے ندیوں کے بہنے کی

میں کہاں کا دانش ور ، میں کہاں کا شاعر ہوں
بس یہ ایک صورت ہے مر کے زندہ رہنے کی

تلملا کے اٹھ بیٹھے آج درد کے مارے
کوئی حد بھی ہوتی ہے ظلم و جور سہنے کی!

کچھ ملال مت کیجے ، دل میں جو ہے کہہ دیجے
آنسوؤں کو عادت ہے چشمِ تر میں رہنے کی

کھو گیا کہیں جیسے حرفِ مدعا اپنا
ہم نہ کہہ سکے ، نظمیؔ ! بات تھی جو کہنے کی

شکار بیٹھ گئے ہیں مچان کے پیچھے
کہ تیر چل نہیں سکتا کمان کے پیچھے

وہ مجھ کو دیکھ رہا ہے ، سو میں بھی دیکھتا ہوں
چھپا ہوا ہے کوئی آسمان کے پیچھے

اُسے یہ رات سمجھ لے تو نور میں ڈھل جائے
جو فلسفہ ہے ہماری اذان کے پیچھے

مگر بنامِ شریعت ہیں سب دریچے بند
اگرچہ باغ بہت ہیں مکان کے پیچھے

حویلیوں سے صدا سسکیوں کی آتی ہے
حکایتیں ہیں بہت خاندان کے پیچھے

نظر میں کیوں نہیں آتا ہے کج کلاہوں کے؟
جو خلفشار ہے امن و امان کے پیچھے

نظر میں رکھتے ہیں ، نظمی ! اُسے بھی اہلِ ہنر
جو پستیاں ہیں اِس اونچی اُڑان کے پیچھے

یہ کیسا روگ لگایا ہے جان کے پیچھے؟
کہ سو خیال رہے اک گمان کے پیچھے

عجیب طرح ہوا امتحانِ عہدِ وفا!
جو بھیڑ تھی ، نہ رہی شمع دان کے پیچھے

سفینہ ڈوب رہا ہے تو ڈوب جانے دو
کہ کشتیاں ہیں بہت بادبان کے پیچھے

یہ کربلا کے بہتّر نفوس ، کیا کہیے!
ہیں شیرخوار بھی پیر و جوان کے پیچھے

وہ میری جان کے خواہاں ، میں جان سے بیزار
عجیب ہے رمز ہے اِس داستان کے پیچھے

اُسے زمانہ سمجھتا تو بات بن جاتی
جو مصلحت تھی ہمارے بیان کے پیچھے

یہ گُم رہی کا زمانہ یونہی نہیں گزرا
بہت یقین تھا وہم و گمان کے پیچھے

خواب میرے مجھے رسوا نہیں ہونے دیں گے
لاکھ خلوت ہو ، یہ تنہا نہیں ہونے دیں گے

ہم وہ قندیلِ شبِ ہجر ہیں محفل میں تری
بجھ بھی جائیں ، اندھیرا نہیں ہونے دیں گے

یہی بہتر ہے کہ خود اپنی مسیحائی کر
یہ معالج تجھے اچھا نہیں ہونے دیں گے

لاکھ تم دائرۂ دشتِ جنوں تنگ کرو
شہر والے یہ تماشا نہیں ہونے دیں گے

فخرِ نیرنگِ جہانِ گزراں ہے انساں
ہم تو انساں کو فرشتا نہیں ہونے دیں گے

فصلِ گل آئی تو ہر پھول پہ حرف آئے گا
خار و خس دل کو شکیبا نہیں ہونے دیں گے

لکھنؤ سے جو عبارت ہیں ، وہ لمحے ، نظمیؔ!
اب کسی شہر کو اپنا نہیں ہونے دیں گے

دشتِ ہجرت میں مکافاتِ سفر کوئی نہ ہو
بس بھی جائیں کہیں ہم لوگ تو گھر کوئی نہ ہو

تم ہمیں مجمعِ اغیار میں کیا ڈھونڈتے ہو؟
ہم اُسی سمت تو ہوتے ہیں جدھر کوئی نہ ہو

ایسے زنداں کہیں تم نے نہیں دیکھے ہوں گے
جس میں دیوار ہی دیوار ہو، در کوئی نہ ہو

صفِ اعدا کے مقابل جو صف آرا ہیں ، وہ لوگ
کس طرف جائیں اگر راہِ مفر کوئی نہ ہو؟

ہم تو اِس بات کے خواہاں ہیں تری محفل میں
ہوں سبھی خندہ بہ لب ، دیدۂ تر کوئی نہ ہو

ایک لمحے میں بدل جاتا ہے پیراہنِ شب
دور تک جب کہیں امکانِ سحر کوئی نہ ہو

ہم اُسی کارِ تخیل کے ہیں جویا اب تک
کچھ نہ ہو جس کا صلہ ، جس کا ثمر کوئی نہ ہو

یہ بھی ممکن ہے صفِ آرا ہوں سبھی پیر و جواں
یہ بھی ممکن ہے کہ لشکر میں اُدھر کوئی نہ ہو

کاش یوں بھی ہو سرافرازیِ یاراں ، نظمیؔ!
پھول ہی پھول سرِ دار ہوں ، سر کوئی نہ ہو

منظوماتِ

مراجعت

لوحِ محفوظ پر کس نے لکھا تھا کیا
میں نہیں سوچتا
تم نہیں سوچتے
لوگ سوچیں تو کیا؟
اِس کہانی کے جتنے بھی کردار تھے
سب ہی رخصت ہوئے
سب ہی رخصت ہوئے

ایک تم رہ گئے
ایک میں رہ گیا
اور یہ میرا ابھی کیا!
میں بھی تیار ہوں
اپنے اگلے سفر کے لیے

تضاد

وہی جو دیکھتے ہو
سوچتے، محسوس کرتے ہو
وہی لکھو
سبھی کو میں یہی تلقین کرتا ہوں
مگر اب اِس کو کیا کہیے؟
میں جو کچھ خود بھی لکھتا ہوں
وہ دنیا ساز باتیں ہیں

مرا دل سوچتا کچھ ہے
قلم کچھ اور لکھتا ہے
زباں کچھ چاہتی ہے
اور لب کچھ اور کہتے ہیں
کہ میں خود بھی نہیں لکھتا
جو پیہم سوچتا ہوں میں
یہ دنیا ساز باتیں ہیں
جو میں لکھتا ہوں، تم لکھتے ہو
یا — سب لوگ لکھتے ہیں
زمانہ ساز باتیں
اپنے آدرشوں سے خالی ہیں
تضادوں کی کہانی ہیں

کارِ ثواب

بلندیوں پہ بظاہر ہیں پستیوں کے مکیں
فلک خیال ہوئے ہیں صداقتوں کے امیں
بھلا دیا ہے سبھی نے محبتوں کا چلن
سوادِ وہم و گماں ہو گئی بساطِ یقیں

بنامِ مندر و مسجد کہیں پہ خون بہا
کوئی خداؤں سے الجھا، کسی نے بت توڑے
کہیں پہ آگ لگی عصبیت کے نعروں سے
غرض کہ بھول گئے ہم سبق اخوت کے

کبھی جو کارِ زیاں تھا ، بنا وہ کارِ ثواب
عجب جنوں ہے ! ٹھکانے نہیں کسی کا دماغ
وفورِ جوش میں بے جان پتھروں کے لیے
بجھا دیے گئے انسانیت کے زندہ چراغ

تجدید

ہزاروں گھر جلائے ہیں
ہزاروں گل کھلائے ہیں
دیے دل کے بجھائے ہیں
ستم اپنوں پہ ڈھائے ہیں
تو غیروں کو مزے بھی موت کے
ہم نے چکھائے ہیں
کسی کے کاسۂ سر سے

کلاشنکوف کی گولی گزاری ہے
ہم انسانوں کی اِس بستی میں
شیطاں بن کے زندہ ہیں
چلو! اب آنے والے سال کے
بارے میں
کوئی فیصلہ کرلیں
کوئی ایسا ہی
پچھلے سا جیسا
عہدِ نو کرلیں

سچ کی صلیب

ہم نے قلم اٹھا لیا
جو بھی تھا دل میں، لکھ دیا
آپ ہمیں بھلے لگے
ہم نے بھلا ہی لکھ دیا
آپ ہمیں برے لگے
ہم نے برا ہی لکھ دیا

آپ بہت خفا ہوئے
ہم بھی تو خوش نہیں ہوئے
سچ کی صلیب کے لیے
حرفِ ستم لکھا گیا
کوئی خوشی نہ کوئی غم
جو بھی تھا دل میں، لکھ دیا
اور — یہی لکھیں گے اب
آپ بھی سچ لکھا کریں
لوگوں کو سچ پسند ہے
جھوٹ کسے عزیز ہے؟
آپ بھی جھوٹ مت لکھیں
آپ بھی سچ لکھا کریں

آسیبی بستی

میں اک ایسی بستی کا
رہنے والا ہوں
جس میں
رات ہوتے ہی
پیڑوں سے
آسیب اتر کر
چلنے پھرنے لگتے ہیں

رات ہوتے ہی

ہر باسی

سکڑا، سمٹا

بستر پر گر جاتا ہے

آوازوں پر کان لگائے

انجانے خدشات کی چادر میں لپٹا

خوف سے تھر تھر کانپتے جسم پر

ٹھنڈا، خالی سر اوڑھے

آسیب زدہ

آدھا سویا، آدھا جاگا

پتھر بن کر رہ جاتا ہے

کون کرے گا فیصلہ؟

ایک جنونِ بے جہت
ایک خیالِ بے سبب
اُس نے بہت برا کیا
گنبدِ شوق ڈھا دیا
عظمتِ فن، خلوصِ من
میرا تقدسِ سلف

نقش و نگارِ بام و در
سنگِ انا کی حرمتیں
میری عبادتوں کی جا
میرا جمال و دبدبہ
اُس نے مٹا مٹا دیا
اُس نے بہت برا کیا
میں نے جواب کیا دیا؟
میں نے تمام اُس کے بت
اُس کے صنم کدوں کے در
دستِ جنوں سے ڈھا دیے
کس نے بہت برا کیا
کون کرے گا فیصلہ؟
کون کرے گا فیصلہ؟

حرفِ سوال

جو لکھا ہے شب کی فصیل پر
کہ جو حرف حرفِ سوال ہے
اُسے پڑھ سکو
تو پڑھو کبھی
یہاں لکھ سکو
تو لکھو کبھی

کسی روشنی کی لکیر کو
کسی چاند کو
کسی آگہی کے سفیر کو
کہ یہی تو فن کا کمال ہے

نیا عہد نامہ

جشن بہت منا لیے
دل کے دیے بجھا دیے
لوگوں کے گھر جلا دیے
جتنے ستم تھے، ڈھا لیے
جور سب آزما لیے
کون سا درد بچ گیا؟

اب نئی آن بان سے
چال کوئی نئی چلو
شوقِ وصال کے لیے
مال و منال کے لیے
مرگِ جمال کے لیے
صبحِ قتال کے لیے
عہد کوئی نیا کرو
جال کوئی نیا بُنو

ناتمام

چھتنار درخت نے کہا تھا:
"میں دھوپ سے لڑ رہا ہوں پیہم
تم سائے میں آکے بیٹھ جاؤ
میں سارے عذاب جھیل لوں گا
تم صرف رفاقتیں مجھے دو"
چھتنار درخت نے کہا تھا
چھتنار درخت اب کہاں ہے!
پردے میں بہار کے خزاں ہے

شاخوں سے جدا ہوئے ہیں پتے
تنہا وہ کھڑا یہ سوچتا ہے
بس میرا وجود ہی ہے سب کچھ
بس میں ہی امر ہوں، سب فنا ہے
سو اُس کے ہی دوستوں نے آخر
پھانسی پہ اُسے چڑھا دیا ہے

ممتا

دودھ جو پیتا ہے
فیڈر سے
وہ بچہ بھی
اپنی ماں کو جانتا ہے
تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد
ماں کہہ کہہ کر
چیختا ہے

انجانے، اَن دیکھے
انسانی جذبوں کو
پہچانتا ہے
سب رشتوں کو
جانتا ہے
ممتا آخر ممتا ہے

رم جھم

اک پھول پہ بیٹھی تتلی نے
جب لب کھولے
اور شور ہوا
اک بوند گری
پھر طوفانی بارش نے
سارے رنگ بکھیرے
گلشن کے
تھے خوب وہ دن بھی!
ساون کے

گمانِ آخر

میں گرا ہوں شب کی فصیل پر
مرے دوستوں کو خبر نہ ہو
مرے دشمنوں کو پکار لو
کہ اُنھیں کے دم سے تھی ضوفشاں
مری کائناتِ فروغِ جاں
اُنھیں علم ہے
کہ نہ بجھ سکے گی
چراغِ کلفتِ غم کی لَو

اُنھیں علم ہے
کہ نیابتِ صفِ دلبراں ہے کہاں کہاں
اُنھیں علم ہے
کہ متاعِ درد کا کارواں ہے رواں دواں
جو رکا ہے اور نہ رکے گا اب
مگر اِس گمان کو کیا کہیں؟
کہ سگانِ شب کے محافظوں کا
اِسی پہ دار و مدار ہے
کہ یہ وار آخری وار ہے

صلیبِ درد

صلیبِ درد

(مجموعۂ کلام)

اصغر مہدی نظمی

نعت

سارے جہاں کے دُکھ کا مداوا رسولؐ ہیں
سب کے طبیب ، سب کے مسیحا رسولؐ ہیں

ہے جن کے دم سے انجمن آرائیِ جہاں
وہ شمعِ نور و نکہتِ دنیا رسولؐ ہیں

جس سے کہ جگمگائی مدینے کی سرزمیں
وہ روشنی ، وہ صورتِ زیبا رسولؐ ہیں

ہیں ناخدائے کشتیِ ایمان و آگہی
اور ڈوبتے ہوؤں کا سہارا رسولؐ ہیں

تم کیوں بھٹک رہے ہو اندھیرے میں ؟ دوستو!
دنیا کی تیرگی میں اجالا رسولؐ ہیں

جس سے ہمیں ملا ہے مساوات کا سبق
وہ رشد و آگہی کا صحیفہ رسولؐ ہیں

اہلِ حرم ! یہ عظمتِ کردار دیکھنا
حُسنِ صفات و ذات کے شیدا رسولؐ ہیں

سیراب جس سے سارا زمانہ ہے آج تک
وہ چشمۂ حیات ، وہ دریا رسولؐ ہیں

اُمّی لقب ملا ہے مگر کس ادا کے ساتھ
ہر بابِ علم و فکر میں گویا رسولؐ ہیں

قصیدہ

وصیِ مصطفیٰؐ کہیے ، علیِؑ مرتضیٰ کہیے
پئے معراجِ ایمانی نصیری کا خدا کہیے

پرِ جبریل تیغِ حیدری سے قطع ہو جائیں
تو پھر ایسی شجاعت کو شجاعت کے سوا کہیے

مساوات و محبت کا اُسی سے درس پایا ہے
اصول و مہر و الفت کا اُسی کو سلسلا کہیے

وہ فتحِ جنگِ خیبر ہو کہ تسخیرِ دل و دنیا
امامِ اولیں کو فاتحِ ارض و سما کہیے

وہ جس کے نام سے روشن ہے مشعل علم و حکمت کی
اُسی کے نام پر بےساختہ صلِ علیٰ کہیے

قدم جب راہِ ہستی میں کسی کے ڈگمگاتے ہیں
تو خود دل بول اٹھتا ہے، علیؑ مرتضیٰ کہیے

سلام

ہر اک نظر میں ، ہر اک دل میں جلوہ گر ہے ابھی
حسینؑ ابنِ علیؑ نازشِ بشر ہے ابھی

میں جانتا ہوں اسلام کا ہر اک لمحہ
غمِ حسینؑ کے مانند معتبر ہے ابھی

جسے نصیب نہیں اعتبارِ فکر و نظر
وہی حسینؑ کی عظمت سے بے خبر ہے ابھی

اُڑائیں خاک نہ کیوں ہم فدائیانِ حسینؑ
کہ آلِ فاطمہ زہراؑ برہنہ سر ہے ابھی

غمِ حسینؑ سے ہم جاوداں بنا لیں گے
یہ اپنی زیست کا لمحہ جو مختصر ہے ابھی

یزیدیت کا کوئی نام بھی نہیں لیتا
حسینیت ہی ہر اک کی زبان پر ہے ابھی

یزید دیکھ لے ! کل جس کا سر تھا نیزے پر
اُسی حسینؑ کا سورج عروج پر ہے ابھی

یزید اب بھی ظلمت ، حسینؑ اب بھی ہیں نور
کہ شام شام ابھی ہے ، سحر سحر ہے ابھی

ہزار صرصرِ دوراں سے بجھ نہیں سکتا
چراغِ ماتمِ شبیرؑ جلوہ گر ہے ابھی

سلام کہنے کو ہم نے بھی کہہ دیا ، نظمیؔ!
مگر خیال کہ لب تشنۂ ہنر ہے ابھی

غزلیات

کلی کے دل میں شرارے، گلوں کے دل میں جلن
عجب بہار ہے اب کے برس درونِ چمن

نکل کے منزلِ شب سے سحر تک آ تو گئے
تیرے خیال کے سائے میں ساکنانِ چمن

سنا رہی ہے نئی منزلوں کے افسانے
گزرتے وقت کی خاموش، پُرسکوں دھڑکن

جنوں نکال لے جی بھر کے حوصلے دل کے
نہ لا سکوں گا میں ہر روز نت نئے دامن

بہار آئی تھی بیگانہ وار سی ، لیکن
گلوں کے ذوقِ نمو نے کھلا دیے ہیں چمن

عجب حدودِ محبت میں آس ٹوٹی ہے!
کہ جاگ جاگ اٹھے زندگی کے رنج و محن

جب آ چکی ہو نگاہوں کے سامنے منزل
تو کیا ہو آبلہ پائی کا عذر ؟ کیسی تھکن؟

ہمیں تو ظلمتِ زنداں کا غم نہیں ، نظمؔی!
کہ جل رہے ہیں دلوں میں چراغِ دردِ وطن

جو بجھے لبوں تک آئی کبھی خواہشِ تبسم
تو لرز لرز گیا ہے یہ ہجومِ ماہ و انجم

مری تلخ زندگی پر کبھی چھا گئے ہو یوں تم
کہ فریب کھا گیا ہے مری روح کا تلاطم

یہی منزلِ جنوں ہے ، دورِ آگہی ہے
کہ پہنچ کے نزدِ منزل ہوئے سارے قافلے گم

مرے گلستانِ دل کی یہ بہارِ بے خزاں ہے
کبھی خار ہنس رہے ہیں ، کبھی گل ہیں پُرتبسم

تجھے یاد کر لیا ہے جو کبھی دلِ حزیں نے
تو سکون دے نہ پایا یہ فروغِ ماہ و انجم

یہ کشاکشِ زمانہ ، یہ ہجومِ درد و حرماں
نہ بجھا سکے لبوں سے کبھی مشعلِ تبسم

یہ مذاقِ جبرِ فطرت بھی عجب شے ہے ، نظمیؔ!
کہیں گریۂ مسلسل ، کہیں نغمہ و ترنم

خبر کس کو ؟ اٹھا طوفاں تو اہلِ دل پہ کیا گزری
سفینے کو ہوا کیا ، دامنِ ساحل پہ کیا گزری

یہ مانا ! حُسنِ خودبیں کا تغافل مشغلہ ٹھہرا
مگر اب کون یہ سمجھے ؟ کسی کے دل پہ کیا گزری

اٹھے جب ہو کے برہم مے کدے سے مے کدے والے
نہ پوچھ ، اے ہم نشیں ! پھر ساقیِ محفل پہ کیا گزری

یہ سب جوشِ جنوں کی ہیں کرم ارزانیاں ، ورنہ
اُنھیں اور اِتنی فرصت ! پوچھتے ، محفل پہ کیا گزری

کچھ اِس کی بھی خبر ہے اب تمھیں ؟ اے قافلے والو!
کہ منزل پہ پہنچ کر طالبِ منزل پہ کیا گزری

جو ہو آسودۂ منزل ، اُسے اب اِس سے کیا مطلب
تلاشِ راہبر میں کاروانِ دل پہ کیا گزری

کچھ اِس طرح سے اب سعیِ تبسم کی ضرورت ہے
کہ تلخیِ غمِ دوراں نہ سمجھے ، دل پہ کیا گزری

بچھڑنا کارواں سے آ گیا جب راس ، اے ہمدم!
تو پھر کیا فکر اِس کی اب ، رہِ منزل پہ کیا گزری

ہجومِ غم میں بھی آئی مرے لب تک ہنسی ، نظمؔی!
سمجھ پائی نہ یہ دنیا کہ میرے دل پہ کیا گزری

نفس نفس سے شباب چھلکے ، نظر نظر سے شراب برسے
تو پھر یہ ساقی کی ہے شرارت جواب بھی بادہ گسار ترسے

تمھارے دل میں ہے بغض ونفرت، بدل سکو گے نہ اپنی فطرت
یقین تم کو نہ آسکے گا کہ مجھ کو الفت ہے سنگِ در سے

امید رکھوں میں اور کیا اب سوائے اِس کے کہ فصلِ گل میں
گلوں کو جھلسا ہوا سا دیکھوں چمن کے نظمِ شرار گر سے

غمِ زمانہ ذرا سی فرصت جو مجھ کو بخشے تو کچھ کہوں میں
تمھارے عارض، تمھارے گیسو، تمھاری الفت بھری نظر سے

کہوں میں کیونکہ بلند آہنگ ہیں آدمیت کے راگ ، ہمدم!
کہ قتل و غارت ہے چار جانب ، الجھ رہا ہے بشر بشر سے

وہ دورِ محکومیت ہی بہتر تھا ایسی آزادیوں سے ، ہمدم!
جو صحنِ گلشن ہی پھونک ڈالے، کرے جو محروم بال و پر سے

ہوا مخالف، فضا میں طوفاں، خلاف موجیں، کنارے لرزاں
مگر میں کشتی بچا ہی لایا بصد عزائم ہر اک خطر سے

یہ حادثاتِ زمانہ گرچہ چبھو رہے ہیں دلوں میں نشتر
مگر ہے اپنا یہ فرض ، نظمی ! بچائیں دامن فساد و شر سے

ہم بھی مسافر ، تم بھی ہو راہی
پھر کس لیے ہو سعیِ تباہی؟

منزل پہ پہنچا ، منزل کے خالق!
آخر کہاں تک بھٹکیں گے راہی؟

عزم و عمل رکھ تُو دل میں محکم
کیسی کشاکش ، کیا ہو تباہی

امن و اماں کے گیت کو گاتا
بڑھتا رہ ، درماندہ راہی!

دل رندوں کا توڑ رہی ہے
ساقی ! تیری کورنگاہی

اور تڑپ لے یاد میں اُن کی
چاند ستارے دیں گے گواہی

رہِ طلب میں ہر جگہ یہی ہماہمی نہیں
کچھ اور آگے بڑھ چلو اگر یہاں خوشی نہیں

جو بجلیوں سے باخبر نہ آندھیوں کی رازداں
میرے خیال میں وہ زندگی بھی زندگی نہیں

بدل دے ساقیِ جمیل ! اگلے ساغر و سبو
کہ مےکشوں کے واسطے اب اِن میں دل کشی نہیں

ہر ایک دل ہے مضطرب ، ہر اک دماغ منتشر
نصیب اب کسی کو بھی خرد کی آگہی نہیں

دعوتِ بہاراں دی جن حسیں نظاروں نے
اُن کی تاب و تب لوٹی کن وفاشعاروں نے؟

جرم کر دیا عائد برق کی نگاہوں پر
کاروانِ گل لوٹا خود اِنھیں بہاروں نے

خود نظر نہ کی ، لیکن اپنی فتنہ ریزی میں
انگلیاں اٹھا تو دیں ہم پر اِن شراروں نے

آج تک نہ مل پایا اپنا آشیاں ، ہمدم!
کوششیں بہت کچھ کیں برق نے ، شراروں نے

رہ روانِ درماندہ بےسب ہوئے مجرم
منزلوں کو لوٹا ہے راہ کے سہاروں نے

حالِ جنوں نظمیؔ سے ہر اک کو شکوہ ہے
کیا کہوں ، کیا جو کچھ اِن خردشکاروں نے

یہ مانا ! کہ گلشن کی ہر شے نئی ہے
مگر پھر بھی نظمِ کہن وہی ہے

ابھی امتحانِ محبت ہے باقی
ابھی عشق میں کچھ جنوں کی کمی ہے

ہے لرزیدہ لرزیدہ نظمِ زمانہ
کہ انسانیت خوں میں ڈوبی ہوئی ہے

نہ قائم رہے گی یہ تاروں کی محفل
وہ دیکھو ! نویدِ سحر آ رہی ہے

اب دیکھنا ہے مجھے نبضِ طوفاں
ابھی زندگی میں بہت کچھ کمی ہے

وہ اک لمحہ جس میں ترا غم ہو شامل
یقیناً وہی حاصلِ زندگی ہے

برنگِ کرم ایک اور تازیانہ!
کہ عقل و فراست ابھی سو رہی ہے

نشیمن کی گر کچھ نہیں تھی حقیقت
تو پھر آج کیا اِس چمن میں کمی ہے؟

چلے تو ہو تم راہِ الفت میں ، نظمیؔ!
مگر سوچ لو ، برق کی رہبری ہے

ہنسیں چاند تارے ، فضا گنگنائے
جو تم مسکراؤ ، جہاں مسکرائے

نظامِ گلستاں نے یوں دل بڑھائے
ٹہنیوں نے خود گل کے دامن جلائے

مرے عزمِ راسخ کی معجز نمائی
ہر اک موجِ طوفاں میں ساحل بنائے

رہِ زیست کتنی بھیانک ہے، ہمدم!
ہر اک سمت بکھرے ہیں بے نور سائے

خزاں کی فسوں کاریاں ہیں یہ، نظمیؔ!
کوئی اب بہاروں سے دھوکا نہ کھائے

کلیاں پژمردہ ، گل اداس اداس
اب بہار آئی ہے بدل کے لباس

رازدارِ چمن تو خار بھی ہیں
صرف پھولوں کا کیوں ہے اِتنا پاس؟

یوں ہنسی لب پہ آ تو جاتی ہے
دل مگر آج تک ہے دردشناس

التفاتِ جنوں کو کیا کہیے؟
دل کو بخشتا ہے اک حسیں احساس

ہم سے آدابِ زندگی سیکھو!
ہم نے پہنا ہے برسوں غم کا لباس

کاروانِ حیاتِ دل ، نظمیؔ!
پا گیا منزلِ امید و آس

کیوں بپھرے بپھرے راہی ہیں ؟ کیوں سہما سہما جادہ ہے؟
اے دوست! کسی آنے والے طوفاں کا اشارا ہو نہ کہیں!

وہ شعلہ جو تیرے دامن کی دن رات بلائیں لیتا ہے
ہشیار ! وہ میری آہوں کا بے باک شرارا ہو نہ کہیں!

رہبر کی عنایت بھول بھی جا ، رہزن کے ستم پر غور نہ کر
اے کارواں والے ! دیکھ ذرا ، منزل نے پکارا ہو نہ کہیں!

یہ ظلمتِ شب ، خاموش فضا ، مسموم ہوا سے بجھتے دیے
اِن سب کی امیدوں کا مرکز اک سرخ ستارا ہو نہ کہیں!

اب وقت کے دھاروں میں، نظمیؔ! کشتی کو بڑھا بے خوف و خطر
موجوں میں نہ پنہاں ہو ساحل ! گرداب کنارا ہو نہ کہیں!

انسان حادثوں کا نشانہ ہے آج کل
یعنی غم و الم کا فسانہ ہے آج کل

غمگیں ہیں پھول ، غنچے فسردہ ، کلی اداس
گزری ہوئی بہار فسانہ ہے آج کل

بغض و حسد ، بغاوت و نفرت کا اِن دنوں
مستقل حیات نشانہ ہے آج کل

وقت بھی بےقرار ، گریباں بھی تار تار
یہ کاوشِ جنوں کا فسانہ ہے آج کل

کُل کائنات مضطرب و مضمحل سی ہے
یوں منتشر نظامِ زمانہ ہے آج کل

نظمی ! نہ پوچھ اب غمِ دوراں کی کیفیت
عالم تمام جس کا نشانہ ہے آج کل

ہر چند کہ رنگینیٔ گل فام بہت ہے
ہم پر اثرِ گردشِ ایام بہت ہے

ممکن ہو تو اے دوست ! کبھی غور بھی کر لے
اِس دور میں کیوں تلخیِ ایام بہت ہے

ہمت میں بلندی ہو تو اے راہ روِ شوق!
منزل کے لیے زحمتِ یک گام بہت ہے

شامل ہو شرابِ نگہِ ناز تو اے دل!
خودآگہیِ عشق کو اک جام بہت ہے

رفتارِ غمِ عشق بہت خوب ہے ، نظمیؔ!
لیکن یہ زمانہ بھی سبک گام بہت ہے

جب تلک دل تیرے غم سے آشنا تھا ہی نہیں
زیست تھی بے کیف ، جینے کا مزا تھا ہی نہیں

ہائے ! اب تو یوں گزر جاتے ہو تم بیگانہ وار
جیسے اب تک تم سے کوئی واسطا تھا ہی نہیں

اِس طرح تم بن گئے ہو حاصلِ صد آرزو
تم سے پہلے جیسے میرا آسرا تھا ہی نہیں

آہ ! وہ عالم کہ دنیا تھی میری آغوش میں
ہائے ! یہ ساعت کہ جیسے کچھ مرا تھا ہی نہیں

یہ بھی ممکن ہے ، نسیمِ صبح کے مانند تُو
یوں چلا آئے کبھی ، جیسے خفا تھا ہی نہیں

اے نگہبانانِ گلشن ! کچھ تو بتلا دو ہمیں
کیا ہماری کاوشوں کا کچھ صِلا تھا ہی نہیں؟

یہ تو قسمت ہے کہ تم منزل سے ہم آغوش ہو
ورنہ تم میں تابِ غم کا حوصلا تھا ہی نہیں

چاک کرتے تھے گریباں یا تو سلجھاتے تھے زلف
تیرے دیوانوں کا کوئی مشغلا تھا ہی نہیں

وہ کرم کرنے پر آمادہ تھے ، نظمیؔ ! اُن دنوں
اور میرے لب پہ حرفِ مدعا تھا ہی نہیں

اِس جہاں میں ، دوستو ! نقشِ وفا تک بھی نہیں
جیسے یہ دنیا محبت آشنا تک بھی نہیں

کر دیا کیا گردشِ دوراں نے ؟ اے جانِ بہار!
دل میں اب تیرا خیالِ جاں فزا تک بھی نہیں

اُن کے افسانے کو رنگینی مرے خوں سے ملی
اور میرا داستاں میں تذکرا تک بھی نہیں

بدگماں ہو کس لیے ؟ کیوں اِس قدر برہم ہو تم؟
میرے ہونٹوں پر تو حرفِ مدعا تک بھی نہیں

بارہا گزرے ہیں اُن راہوں سے اہلِ کارواں
جن میں منزل کا نشاں کیا ، نقشِ پا تک بھی نہیں

آ رہی ہے دیر سے کانوں میں آوازِ جرس
اور راہِ شوق میں اک قافلا تک بھی نہیں

تم تو کیا ، اب وہ عالم ہے کہ نظمیؔ ! اِن دنوں
مرکزِ امید کچھ میرا خدا تک بھی نہیں

اہلِ گلشن ہیں پریشاں ، کوئی پیغام ذرا
جلوۂ صبحِ بہاراں ! کرمِ تمام ذرا

رہ نہ پائے گی یہ بے کیفیِ مینا و ایاغ
جرأتِ رند تو ہو جائے خوش انجام ذرا

یہ مچلتی ہوئی صبحیں ، یہ مہکتی شامیں
یوں ہی قائم رہے رنگِ سحر و شام ذرا

طالبِ دید جلائیں گے نگاہوں کے دیے
جلوۂ حُسنِ فراواں ہو سرِ بام ذرا

روکتی ہے ہمیں شوریدگیِ راہ ، مگر
عزمِ دل کہتا ہے ، اک گام ، بس اک گام ذرا

شاید آ جائے خزاں پر رخِ رنگیں کی بہار
لے کے دیکھیں تو سہی ہم بھی ترا نام ذرا

ہائے نظمیؔ ! وہ زمانہ ، وہ سکوں تر لمحے
اور یہ عالم کہ کسی کل نہیں آرام ذرا

بادہ و خم نہ کوئی جام ہے مے خانے میں
زندگی تشنہ و ناکام ہے مے خانے میں

ہر فسانے میں حقیقت کی جھلک ملتی ہے
آج وہ لذتِ اوہام ہے مے خانے میں

رند و ساقی ہیں پریشاں ، خم و ساغر ہیں اداس
شورشِ گردشِ ایام ہے مے خانے میں

مے کشو ! خوب ہے یہ ساقیِ دوراں کا کرم
نشّہ و کیف بھی بدنام ہے مے خانے میں

اِن دنوں روکشِ حالات ہیں رند و ساقی
اِن دنوں تشنہ لبی عام ہے مے خانے میں

پھر تری زلفِ سیہ مست پہ الزام آیا
پھر ترا ذکر سرِ شام ہے مے خانے میں

وہی نظمیؔ ، وہی بدمست و پریشاں مے نوش
اِن دنوں تشنۂ یک جام ہے مے خانے میں

نہ کچھ شورِ نظر ہے ، نہ کچھ قرینا ہے
بس اک فریبِ مسلسل ہے اور جینا ہے

یہ عزمِ خاص جو ساقی نے جام میں ڈھالا
بدمست خود وہی زہراب آج پینا ہے

ابھی کچھ اور حوادث سے تجربے ہوں گے
ابھی کشادہ بہت کچھ ہمارا سینا ہے

حضور دل کے تقاضوں سے بے خبر نہ رہیں
بہت سبک ، بڑا نازک یہ آبگینا ہے

سرشتِ حضرتِ آدم نہ پوچھیے ، نظمیؔ!
لبوں پہ نغمۂ اخلاص ، دل میں کینا ہے

سارے جہاں کے زخمِ جگر سی رہے ہیں ہم
تزئینِ زندگی کے لیے جی رہے ہیں ہم

تازہ کچھ اور رنج و مصائب کے سلسلے
اے شورشِ حیات ! ابھی جی رہے ہیں ہم

ہر چند سازگار نہیں رنگِ مے کدہ
باعزمِ بادہ نوش مگر پی رہے ہیں ہم

یہ شورشِ جہاں ، یہ حوادث کے سلسلے
ہمت شکن ہزار سہی ، جی رہے ہیں ہم

اے کاروانِ موسمِ گل ! رک ذرا ابھی
دامن کے چاک تیرے لیے سی رہے ہیں ہم

طوفانِ رقص و رنگِ شبانہ کے باوجود
غرقِ سرورِ کیفِ الم ہی رہے ہیں ہم

نظمیؔ ! چمن چمن کسی ہماں شکن کے ساتھ
بیگانۂ بہار و خزاں بھی رہے ہیں ہم

زنجیر کھنکتی ہے پسِ پردۂ زنداں
یارانِ قفس ! مژدۂ تحریرِ بہاراں

ہم نے بھی تیری دھوم کا دیکھا ہے چراغاں
جلتے ہوئے ایوان ، سلگتے ہوئے انساں

کیا کہیے کسی سے غمِ احساسِ فراواں
ہے شکوہ بہ لب آج محبت بھی ، مری جاں!

بادیدۂ شبنم ، بزبانِ گل و لالہ
چھیڑے تو کوئی قصۂ اربابِ گلستاں!

کشتی کو مری کیا ہو کناروں کی تمنا؟
اک سلسلۂ زیست ہے ہر موجۂ طوفاں

شامل مرے اشکوں میں ہے خونِ چمن افروز
نکھرے کا ابھی اور ہر اک داغِ گلستاں

نظمیؔ ! مرے سینے میں جواں عزم ستارے
روشن ہیں بڑی دھج سے بہ ایں ظلمتِ زنداں

شام کے دھندلے دھندلے سائے نورِ سحر تک آ پہنچے ہیں
تیری یاد میں روتے ہنستے پچھلے پہر تک آ پہنچے ہیں

گلشن کی ہنگامہ روی میں صبر کا دامن چھوٹ رہا ہے
غنچہ و گل باضبطِ مسلسل دیدۂ تر تک آ پہنچے ہیں

ہم لوگوں کی بات الگ ہے، ہم نے ہنس کر زخم سہے ہیں
ہم ہی فرازِ دار سے بڑھ کر آپ کے در تک آ پہنچے ہیں

درد کو چپ چپ سہنے والو! کب تک یوں برباد رہو گے؟
ظلم کے طوفاں بڑھتے بڑھتے اب تو سر تک آ پہنچے ہیں

کچھ تو کہو غم ناک ستارو! کس کا دامن رنگیں ہوگا؟
قلب و جگر سے خون کے قطرے چشمِ بشر تک آ پہنچے ہیں

زنداں کے پُرہول اندھیرے آج تو تھر تھر کانپ رہے ہیں
آج بھی کچھ دیوانے شاید جشنِ سحر تک آ پہنچے ہیں

نظمیؔ! جیتے جی مر جاتے، خاک نہ ہم در در کی اُڑاتے
آہ! مگر وحشت کے اشارے، عزمِ سفر تک آ پہنچے ہیں

نہ وہ نغمہ و ترنم ، نہ وہ اشک ہیں ، نہ آہیں
ترے غم نے ڈھونڈ لی ہیں کہیں اور اب پناہیں

چلو ! منزلِ جنوں سے کوئی ساز باز کر لیں
کہ فریب دے رہی ہیں ہمیں پُرخلوص راہیں

میرے ہر نفس میں تم ہو ، بہ ایں شورشِ زمانہ
تمھیں اپنے دل سے پوچھو، تمھیں اور کیسے چاہیں؟

میرے ذوقِ جستجو نے نہ کہیں سکون پایا
جو قریب آئی منزل تو بدل گئی ہیں راہیں

ترے دل کی دھڑکنوں میں نہ ہو گر وقارِ آدم
تو نگارِ صبحِ دوراں ! تجھے ہم کبھی نہ چاہیں

شبِ ہجر میں سدھارے مرے درد کے سہارے
یہ بجھے بجھے سے تارے بھلا کب تلک نباہیں؟

کبھی ملتفت ہوئی ہے جو نگاہِ برق ساماں
تو چمک چمک اٹھی ہیں غمِ دل کی بارگاہیں

جہاں لٹ گئی ہے ، نظمی ! مری حسرت و تمنا
وہیں مسکرا اٹھی ہیں یہ حسیں جلوہ گاہیں

وقت کے قاتل ہاتھ میں، پیارے! کتنوں کے حلقوم رہے ہیں
خون ہے کس کس کا گردن پر، لیکن یہ معصوم رہے ہیں

غم کے سایو! تم بھی بولو، کب تک اپنے ساتھ رہو گے؟
وہ پیارے پیارے لمحے تو اب بھی نظر میں گھوم رہے ہیں

آپ کی رفعت، آپ کی عظمت رنگ محل کے میناروں تک
لیکن انساں کے نغمے تو اوجِ فلک کو چوم رہے ہیں

مُہر لگی ہے اپنے لبوں پر ، قید بھی ہیں اک مدت سے ہم
دبتے شعلے لیکن اب تو ظلم کا دامن چوم رہے ہیں

روپ بدل کر آزادی کے نام کو تہمت کیوں دیتے ہو؟
جانتے ہیں سب شکلِ غلامی ، صدیوں تک محکوم رہے ہیں

جشنِ سحر کے متوالو ! اک سیلِ بہاراں آ پہنچا ہے
دیوانے اب پھول کھوتے زنداں زنداں گھوم رہے ہیں

اُن کے جلوے عام کہاں ہیں ؟ دل کو کسی نے بہکایا ہے
ہم دُکھیارے اک مدت سے یوں ہی در در گھوم رہے ہیں

عیش و طرب کے لمحے یوں تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں
عرصہ گاہِ زیست میں ، نظمیؔ ! پھر بھی ہم معصوم رہے ہیں

درد محبت کے افسانے ، اوصافِ اجداد نہیں ہیں
ہم کو تجھ سے پیار ہے، لیکن ہم قیس و فرہاد نہیں ہیں

کس نے برسوں جی کو جلایا، کون بہاراں لے کر آیا
اہلِ قفس کے افسانے اربابِ چمن کو یاد نہیں ہیں

غیر کی بزمِ ناز میں کیوں تم کھوئے کھوئے سے رہتے ہو؟
بیتی باتیں، گزرے لمحے اب مجھ کو تو یاد نہیں ہیں

شدتِ غم میں اشک بھی اکثر سیلِ تبسم بن جاتے ہیں
مجبورًا ہم ہنس دیتے ہیں ، ورنہ دل تو شاد نہیں ہیں

کتنے دریدہ دامن پائے ، کتنے ویراں گلشن دیکھے
آج بھی جو بافیضِ بہاراں ویران و برباد نہیں ہیں

چپ چپ درد سہے جاتے ہیں ، آنسو پی پی کر ہنستے ہیں
ہم دل والے ، ہمت والے مرہونِ فریاد نہیں ہیں

جیون کی ہر لہر میں جیسے امڈے ہوئے ہوں دُکھ کے ساگر
جب سے اُس کو اپنایا ہے ، نظمیؔ ! ہم بھی شاد نہیں ہیں

کیسے کیسے لمحے بیتے!
وہ بھی نہ ہارے ، ہم بھی نہ جیتے

اُس کی نظر سے پیتے پیتے
لمحے پیارے پیارے بیتے

دورِ بہاراں بیت گیا
اپنا دامن سیتے سیتے

جانِ بہاراں بن بیٹھے ہیں
خار چمن خود پیتے پیتے

عیش کے لمحے سائے میں غم کے
سوچ رہا ہوں ، کیسے بیتے

غنچہ و گل ! تم ہی بتلاؤ
اب کے برس دن کیسے بیتے؟

موت سے رسم و راہ بڑھائی
نظمیؔ ! ہم نے جیتے جیتے

وقت جب کروٹیں بدلتا ہے
آدمی فطرتاً سنبھلتا ہے

زندگی ! جاگ اٹھا شعورِ حیات
رنگ احساس کا بدلتا ہے

اِس تبسم سے کھائیے نہ فریب
غم ۔ کا یوں بھی چراغ جلتا ہے

منزلِ غم اداس ہو کہ نہ ہو
قافلہ آنسوؤں کا چلتا ہے

اوجِ انسانیت! کہاں ہے تُو؟
آدمِ نوجہاں بدلتا ہے

جادۂ پُر فریب میں اکثر
منزلوں کا پتا بھی چلتا ہے

دل منور ہے یاد سے تیری
تیرگی میں چراغ جلتا ہے

شاہراہِ حیات میں، نظمیؔ!
تجربہ زندگی بدلتا ہے

دنیا کے غم دل میں پلتے
جینے کے انداز بدلتے

رُت بدلے گی رفتہ رفتہ
دیر لگے گی وقت بدلتے

پاؤں کے چھالے پھول بنے ہیں
راہِ طلب میں چلتے چلتے

منزل کا اصرار تھا ، ورنہ
ہم کب اپنی راہ بدلتے

سوچ جو لیتے جشن سے پہلے
دیپ ہی جلتے ، دل تو نہ جلتے

عمر بڑی مشکل سے کٹی ہے
سیدھی راہ پہ چلتے چلتے

وقت نے کتنے پلٹے کھائے
ظلم کا سورج ڈھلتے ڈھلتے

نظمیؔ ! صبحِ طرب تک آئے
غم کی آگ میں جلتے جلتے

وہ جو ایذا پسند ہوتے ہیں
عیش و غم سے بلند ہوتے ہیں

جتنے بھی ہوش مند ہوتے ہیں
جانے کیوں خودپسند ہوتے ہیں!

مے کشو ! جتنی پی سکو ، پی لو
درِ مے خانہ بند ہوتے ہیں

بعض اوقات حادثاتِ حیات
کس قدر سودمند ہوتے ہیں!

جادۂ عشق میں بہ فیضِ جنوں
چند ہی ہوش مند ہوتے ہیں

زندگی کے معاملاتِ حسیں
زندگی سے بلند ہوتے ہیں

راحتیں چومتی ہیں اُن کے قدم
وہ جو مشکل پسند ہوتے ہیں

میری قسمت میں عشرتیں ہی سہی
آپ کیوں فکر مند ہوتے ہیں؟

اہرمن دیکھ! پستیوں والے
اِن دنوں سربلند ہوتے ہیں

اور بڑھتا ہے عزمِ اہلِ قفس
جس قدر قید و بند ہوتے ہیں

قحطِ اہلِ وفا نہیں ، نظمیؔ!
اپنے جیسے بھی چند ہوتے ہیں

چراغِ دیدۂ دل جب بھی جل گئے ہوں گے
حدودِ غم سے مسافر نکل گئے ہوں گے

یہ شہریارِ طرب اِتنے غمگسار نہ تھے
ستم ضرور اب اِن کے بدل گئے ہوں گے

پیامِ صبحِ بہاراں چمن میں آتے ہی
گلوں کے لب پہ تبسم مچل گئے ہوں گے

شبِ الم کو مسرت سے کاٹنے والے
خیالِ صبحِ طرب سے بہل گئے ہوں گے

ہم اہلِ شرق کچھ اِتنے سبک خرام نہ تھے
مقامِ شوق سے آگے نکل گئے ہوں گے

کبھی تو درد میں لذت بھی مل گئی ہوگی!
کبھی تو درد کے مارے سنبھل گئے ہوں گے!

تلاشِ یار میں نکلا ہے کاروانِ حیات
چراغ کتنے سرِ راہ جل گئے ہوں گے!

جو راس آ گئے ، نظمیؔ ! نشاطِ ہستی کو
وہ سانحات ترے غم میں ڈھل گئے ہوں گے

ہجومِ غم میں چراغِ نشاط جلنے لگا
وہ رات ڈوب گئی ، دیکھ ! دن نکلنے لگا

جو چشمِ وقت ہوئی ملتفت تو ہم نَفَسو!
نگاہِ ناز کا مارا ہوا سنبھلنے لگا

وہ غم گساریِ گُل ہے دلوں میں اب کے برس
کہ رُت بدلنے سے پہلے چمن بدلنے لگا

متاعِ زیست نئی دل جلا بہار گئی
تمھارا درد ملا اور وہ ہی کھلنے لگا

صبا جراحتِ پنہاں لیے ہوئے آئی
غمِ حبیب غمِ زندگی میں ڈھلنے لگا

میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے جب تھک گیا نگاہِ وفا
تو اپنی آنکھ کا جادو ہی مجھ پہ چلنے لگا

ستارے خون میں غلطاں ملے جو آخرِ شب
تو صبحِ نو کے تصور سے جی دہلنے لگا

نگاہِ گرم کی دل دار پرسشوں کے طفیل
رخِ حیات کا ہر زاویہ بدلنے لگا

گریز کر نہ سکا دامنِ نگارِ حیات
سرشکِ خوں مری پلکوں پہ جب مچلنے لگا

خیالِ دوست میں ، نظمؔی ! شبِ فراق کٹی
تو کوہِ درد و الم سامنے سے ٹلنے لگا

بیانِ گیسو و عارض ، حدیثِ لب کچھ اور
کہ تا سحر تو نبھانی ہے رسمِ شب کچھ اور

ہر ایک تیرِ ستم آسماں سے ہے منسوب
مگر یہ کون بتائے کہ ہے سبب کچھ اور

نہ جانے کتنے اندھیروں کے بعد پائی ہے
رہِ وفا کے اجالوں نے تاب و تب کچھ اور

نکھر رہے ہیں خد و خالِ آرزوئے حیات
اِسی لگن میں گزرنے دو روز و شب کچھ اور

فسردگی کا مداوا تو خیر کیا ہوتا!
بنا گیا ہے نیا دور جاں بہ لب کچھ اور

حدِ ستم نہیں صیاد پر ہی ختم کہ ہیں
چمن سے تا بہ چمن صاحبِ غضب کچھ اور

تمام عمر کی تہمت جسے کہیں، نظمیؔ!
مٹا رہا ہے وہی لطفِ بےسبب کچھ اور

ایک شعر

جانے کس دُھن میں گزرتے ہیں شب و روز کہ اب
کوئی احساس نہیں ہے مجھے تنہائی کا

سو گئے جاگتے لمحے آخر
وقت بے مہر شبستاں نکلا

قافلہ موسمِ گل کا اب کے
شہر سے چاک گریباں نکلا

نالہ کش تھا جو شبِ غم ، وہ گل
صبح آئی تو غزل خواں نکلا

ایک اک شخص ملا بچھڑا ہوا
اُس سے ملنے کا نہ امکاں نکلا

ہم نے چاہا تھا بھلانا اُس کو
اُس کا غم بھی غمِ دوراں نکلا

منشائے لطفِ جور و جفا کس سے پوچھیے؟
کیوں دل ہے پائمالِ وفا ، کس سے پوچھیے؟

اب اور کتنی دور ہیں یاروں کی منزلیں؟
ہے راہ زن بھی آبلہ پا ، کس سے پوچھیے؟

دامن دریدہ ، چاک گریباں ہے کون کون
اے ساکنانِ شہرِ وفا ! کس سے پوچھیے؟

دل کے زخم جراحتِ پیہم سے کھل اٹھے
آئی ہے کس طرف سے صبا ، کس سے پوچھیے؟

اُس زلفِ پریدہ کی حکایت بھی نہیں ہے
یہ سلسلۂ زیست کہ تہمت بھی نہیں ہے

اب دل ہدفِ سنگِ ملامت بھی نہیں ہے
اب تیری توجہ کی ضرورت بھی نہیں ہے

کیا کیجیے افسانۂ احساس مرتب
دنیا رمقِ رنگِ حقیقت بھی نہیں ہے

اک عمر سے آباد ہیں اُس شہر میں ہم لوگ
جس شہر میں کچھ رسمِ مروت بھی نہیں ہے

بیدار نہ ہو کیوں جرسِ شب کی صدا سے
وہ دل جو ابھی مائلِ غفلت بھی نہیں ہے

کچھ دل سے گریزاں ہے تری یاد بھی ، اے دوست!
کچھ فکرِ جہاں سے مجھے فرصت بھی نہیں ہے

دشوار نہ پہلے تھا ، نہ اب ہے ترا ملنا
لیکن یہ ہر اک شخص کی قسمت بھی نہیں ہے

آنکھوں میں ہے اک سلسلۂ خوابِ پریشاں
جو اپنے مسائل سے عبارت بھی نہیں ہے

کیا جادۂ انوارِ سَحر سے اُسے نسبت؟
جو راہ نوردِ رہِ ظلمت بھی نہیں ہے

رقصاں ہے سرِ گلشنِ ایجاد وہ خوشبو
جو کوچۂ دل دار کی نکہت بھی نہیں ہے

ہیں درپئے آزار وہی لوگ کہ جن کو
سنتے ہیں ، کوئی مجھ سے عداوت بھی نہیں ہے

حیراں ہوں سرِ رہ گزرِ شوق کہ نظمیؔ!
مجھ سا تو کوئی سایۂ غربت بھی نہیں ہے

برق کی کوششِ تخریب کا کچھ خوف نہ کر
اِس میں تعمیرِ نشیمن کے اشاروں کو بھی دیکھ

دفن ہیں جن میں حقیقت کے ضیاریز گہر
اُن ہی ویرانۂ ماضی کے مزاروں کو بھی دیکھ

بھول جا پچھلی تباہی کے فسانے ، اے دوست!
تو نے دیکھا ہے خزاں کو تو بہاروں کو بھی دیکھ

اک نئے رنگ کا طوفان اٹھانا تجھے
وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے دھاروں کو بھی دیکھ

جن کے دم سے امیروں کا تنومند جہاں
اُن کی مدقوق نگاہوں کے اشاروں کو بھی دیکھ

مےکدہ ساز بہاروں کو تو کل دیکھ چکا
آج اجڑی ہوئی ، بےکیف بہاروں کو بھی دیکھ

تو اگر سارے چمن کا ہے نگہباں ، اے دوست!
پھول کی گود سے لپٹے ہوئے خاروں کو بھی دیکھ

افقِ شرق سے جو ہوں گے بہت جلد طلوع
دیدۂ غور سے اُن سرخ ستاروں کو بھی دیکھ

تم بھی ناعاقبت اندیش ہوئے دل کی طرح
مطمئن بیٹھے ہیں آسودۂ منزل کی طرح

کہیے کیا قصۂ نومیدیِ حالات کہ ہم
نوگرفتارِ بلا ہی رہے ساحل کی طرح

رہ گزارِ غمِ ہستی سے گزر جاتے ہیں
لوگ اکثر کسی آوارۂ منزل کی طرح

بزمِ یارانِ محبت کی وہ رونق نہ رہی
دل کی محفل بھی ہوئی غیر کی محفل کی طرح

ہم کو احساسِ گراں باریِ موسم کیا ہو؟
ہم ہیں گلشن میں اسیرانِ سلاسل کی طرح

جانے کس دھن میں تجھے بھول گئے دیوانے!
تو کہ تھا دل میں تمناؤں کے حاصل کی طرح

کیا کریں شکوۂ افتادگیِ راہ کہ اب
تم بھی ہو مجھ سے گریزاں مری منزل کی طرح

عسرتِ زیست کے دن یاد کسے آتے ہیں
سیلِ عشرت میں سکونِ دل ساحل کی طرح

خوفِ رسوائیِ آدابِ وفا ہے ، نظمیؔ!
ورنہ ہم لوگ بھی تھے اپنے مقابل کی طرح

وہ ربط ، وہ خلوص ، نہ وہ سلسلا رہا
بدلا کچھ ایسا وقت کہ میں دیکھتا رہا

وہ ایک آدمی جو مجھ ہی میں چھپا رہا
مجھ سے ہی روز میرا پتا پوچھتا رہا

رسم و رواجِ شہرِ وفا دیکھتا رہا
میں اپنے آپ ہی سے نبردآزما رہا

مجھ کو نہ مل سکا مری تخلیق کا صلہ
تجھ کو تو اک زمانہ خدا مانتا رہا

ہر دورِ آگہی کی ہوئی مجھ سے ابتدا
ہر دور کے خلوص کی میں انتہا رہا

تم اپنی الجھنوں میں مجھے بھولتے گئے
میں تم کو یاد کر کے پریشان سا رہا

خواب و خیال ہو گئی بزمِ طرب تو کیا؟
آنکھوں میں ایک شہرِ تمنا بسا رہا

میں شوقِ جستجو میں سرِ دشتِ زندگی
سورج کی تیز دھوپ میں سایا بنا رہا

کچھ زخم تھے سو مرہمِ دوراں نے بھر دیے
اب سوچتا ہوں میں کہ مرے پاس کیا رہا

نظمیؔ ! گزر سکی نہ سلیقے سے زندگی
ہر روز ایک خواب نیا دیکھتا رہا

منظومات

دھوپ

کتنے جاں سوز مراحل سے گزر کر میں نے
تجھ کو چاہا ہے ، تجھے پانے کی کوشش کی ہے
سینۂ چرخ پہ بکھرے ہوئے مہ پاروں کو
اپنے دامن کی طرف آنے کی دعوت دی ہے

اپنے تاریک شبستاں کو تری یادوں سے
مہر و مہتاب کا ہم رنگ بنا رکھا ہے
آرزوؤں کے حسیں پھول کھلا کر میں نے
باغ امید و تمنا کا سجا رکھا ہے

دوش و فردا کے حسیں خاکوں پہ رقصاں ہے نظر
زندگی عزمِ بہاراں سے مہک اٹھی ہے
تیرا پیمانِ وفا اور ترا پیغامِ خلوص
دل میں بجھتی ہوئی اک آگ دہک اٹھی ہے

اے مری جانِ تمنا ! مری فردوسِ نظر!
میری دنیائے تخئیل ! مری مینائے غزل
تیری پلکوں پہ یہ آنسو ، یہ شرارے کیسے؟
کیوں فسردہ ہیں تری آنکھوں کے مخمور کنول؟

جانتا ہوں ، مجھے معلوم ہے سب کچھ ، لیکن
زندگی صرف محبت پہ نہیں پل سکتی
تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں بھی گر مل جائے
میرے ماحول کی یہ دھوپ نہیں ڈھل سکتی

آدرش

جگمگاتے ہوئے ماضی کے حسینو ! آؤ
اک ذرا دیر ہم آغوش ہی ہو لوں تم سے
غم زدہ روح کے اے خندہ جبینو ! آؤ
اک ذرا بھولی ہوئی بات ہی پوچھوں تم سے

کیا تمھیں یاد ہے وہ ساعتِ پُرکیف کہ جب
اپنی بے تاب تمنا سے پریشاں ہو کر
میرے ہونٹوں پہ بکھیری تھیں گلابی صبحیں
تم نے جذبات کے طوفاں میں انساں ہو کر

مجھ کو بخشی تھی بصد رنگ محبت کی اساس
میری آغوش میں بھر دی تھیں مہکتی خوشیاں
اور میں نے اِسی اخلاص کی نرمی کے طفیل
بھول کر اپنے مقدر کو چنی تھیں کلیاں

رات کی تیرہ جفاؤں میں چراغاں کر کے
اک نئے عزم ، نئے خواب سے ٹکرایا تھا
زندگانی کی ہر اک تلخ حقیقت سے پرے
اک مسرت کا ہیولا سا جو لہرایا تھا

جانے کیوں اب بھی پشیمان کیے رہتا ہے!
ہر ہنسی خندۂ شبنم کا اثر رکھتی ہے
مسکراتا ہوں تو غمگین سا ہو جاتا ہوں
آتی جاتی ہوئی ہر رات مجھے ڈستی ہے

میری کمھلائی ہوئی زیست کی روتی کلیاں
دیکھ کر تم کو مگر آج بھی کھل جاتی ہیں

میری بےنور سی آنکھوں کی بھٹکتی کرنیں
بزمِ ناہید سے جا جا کے پلٹ آتی ہیں

پھر بھی کچلے ہوئے احساس کا مبہم پرتَو
تلخ تر گردشِ آلام سے ٹکراتا ہے
حوصلے جرأتِ ناکام کو مل جاتے ہیں
جذبۂ مفلس و نادار تڑپ جاتا ہے

اور مٹ جاتے ہیں پھر دل کی ہزیمت کے نشاں
ساری دنیا مجھے ملتی ہے پریشان و حزیں
مضطرب سارا زمانہ نظر آتا ہے مجھے
اپنے حالات سے مجبور، پریشان و حزیں

جگمگاتے ہوئے ماضی کے حسینو! آؤ
اک ذرا دیر تخیل میں بسا لوں تم کو
اپنے جھلسے ہوئے، تپتے ہوئے ارمانوں میں
عہدِ حاضر کا میں آدرش بنا لوں تم کو

بن باس

آج ہی تارے ڈوبے ہوں گے
آج ہی سورج نکلا ہوگا
آج ہی میرے گھر والوں نے
میرا رستہ دیکھا ہوگا
آج ہی میرا ویراں کمرا
تنہائی کا درد لیے
غمگیں نغمے گاتا ہوگا

الماری میں بند کتابیں
گہری سوچ میں ڈوبی ہوں گی
ماہ و سال کی گرد میں لپٹی میز کے اوپر
ایک کیلنڈر رکھا ہوگا
جس پر سولہ سال پرانی
تاریخوں کا سایہ ہوگا
میری تصویر سے شاید
تم نے بھی یہ پوچھا ہوگا
میں نے کیوں گھر چھوڑ دیا تھا
میں نے کیوں بن باس لیا تھا
آج یہی میں پوچھ رہا ہوں
لیکن کون بتائے؟
میں نے کس کے پیار کی خاطر
کانٹوں کا بن پار کیا تھا؟
میں نے کیوں صدیوں کے رشتے
ایک ہی پل میں توڑ دیے تھے؟
اُس کا کوئی دوش نہیں تھا؟
میں خود سے بھی روٹھ گیا تھا

صحیفہ

سلگتے لمحے یہ کہہ رہے ہیں
کہ آسماں سے زمیں کی جانب
پھر آنے والا ہے اک صحیفہ
اور اُس صحیفے کے سرورق میں
قرونِ وسطیٰ کی داستانیں چھپی ہوئی ہیں
قرونِ وسطیٰ
کہ اب بھی تخلیق کر رہا ہے

ہزار فرعونِ حشر ساماں
ہزار شدادِ عصرِ حاضر
جو زندگی کی حقیقتوں کو
قدم قدم پر مٹا رہے ہیں
جو ایٹمی طاقتوں کی زد میں
تمام دنیا کو لا رہے ہیں

سلگتے لمحے یہ کہہ رہے ہیں
کہ امنِ عالم کا نام لے کر
جو ویت نامی مجاہدوں پر
درندگی کا لباس اوڑھے
پھر آج یلغار کر رہے ہیں
اُنھیں یہ شاید خبر نہیں ہے
اُنھیں یہ شاید خبر نہیں ہوگی
کہ آسمان و زمیں کی گردش
ٹھہر گئی تو کہاں وہ ہوں گے

نئی کرن

اٹھو اور اٹھ کے چاک کر دو ظلمتوں کا پیرہن
کہ دور افق پہ اب مچل رہی ہے تازہ دم کرن

یہی دیے کہ جن سے جگمگا رہی ہے انجمن
یہی دیے کریں گے انقلابِ نو ضیا فگن

کہے گا کون پھر بھلا اِسے بہارِ غم شکن؟
روش روش غبار ہے تو ہے دھواں دھواں چمن

نظامِ کہنہ کی تمام بندشوں کو توڑ دو
خدائے جبر و جور کی مٹا کے رکھ دو انجمن

یہ کیا ہوا کہ اب ترا شعور چونکتا نہیں؟
کہ تیری زندگی کی لاش آج بھی ہے بے کفن

خزاں کی سحرکاریاں کہ باغباں نے ، ہم نشیں!
مسل کے خود ہی رکھ دیا ہر ایک غنچہ و چمن

تڑپ رہے ہیں اِنس و جاں ، ہر ایک شے ہے خوں چکاں
حکومتوں کے سائے میں کھڑے ہیں سانپ اٹھائے پھَن

مسافرانِ منزلِ حیات برق گام ہیں
اور اب تو اُن کی گرد بھی نہ پا سکے گا راہ زن

نویدِ انقلابِ نو سنانا ہے عوام کو
نہیں ہے ، نظمی ! وقت کہ دکھا سکوں کمالِ فن

رنگِ بہار

خزاں نما میں یہ فصلِ بہار دیکھ تو لوں
لٹے لٹے سے سبھی برگ و بار دیکھ تو لوں

شعورِ زیست کا انجامِ کار دیکھ تو لوں
فضا کی برہمی و انتشار دیکھ تو لوں

تمام عمر میں رویا ہوں خون کے آنسو
تجھے بھی آج ذرا اشکبار دیکھ تو لوں

یہ بہکی بہکی ہوائیں ، یہ مست مست گھٹا
ٹھہر جنوں ! کہ یہ رنگِ بہار دیکھ تو لوں

ابھی نہ خاکِ نشیمن اُڑائے بادِ صبا
کہاں کہاں رہے برق و شرار ، دیکھ تو لوں

ترے حسین تبسم پہ آج ، اے ہمدم!
ہزار غنچہ و گل کو نثار دیکھ تو لوں

نظر نظر سے چھلکنے لگا ہے درد پھر آج
نفس نفس کو ذرا غمگسار دیکھ تو لوں

کبھی کا اٹھ گیا ہوتا میں تیرے در سے ، مگر
یہ سوچتا ہوں ، تجھے ایک بار دیکھ تو لوں

کروں گا اُن کے تغافل کا پھر گلا ، نظمی!
خود اپنے شوق کو میں ایک بار دیکھ تو لوں

انقلاب

سحر ابھی نہ آ سکی ، نہ مٹ سکیں یہ ظلمتیں
اندھیری رات ہی میں آج سرخ خوں سے ، ہم نشیں!
جہاں کی بزمِ عیش میں دیے جلا رہا ہوں میں
کہ تُو فریب پر فریب یوں ہی کھائے جائے گا
سیاہ رات کو تُو یوں ہی صبحِ نو بتائے گا
تُو اپنی منزلوں سے دور اور دور جائے گا
کہ ظلمتوں کا یہ طلسم ٹوٹ کر رہے گا اب
عوام اپنے فرض کو سمجھ چکے ہیں ، ساحرو!
سیاہیوں کی گود سے ڈھلک پڑی وہ سرخ ضو!
فضا میں شعلہ ہائے سرخ ہر طرف بکھر گئے

بغاوتوں کا آفتاب یوں ہے آج ضوفشاں
تڑپ رہا ہے عزمِ نو ، لرز رہا ہے دوجہاں
مگر یہ کیوں؟ ابھی سے کیوں؟ سہم رہے ہو؟ ساحرو!
ابھی تو ابتدا ہے یہ جنوں طراز عزم کی
ابھی تو کسمسا رہے ہیں اونگھتے عوام بھی
ابھی تو کام کر رہی ہے خواجگی ، شہنشہی
ابھی تمھارے ذہن مل کے کر رہے ہیں مشورے
کہ بڑھ کے ڈال دو کمند ابھرتے آفتاب پر
مگر تمھارے بس کا یہ نہیں ہے روگ ، ساحرو!
تم اُس کی ہر کرن پہ کیا کمند ڈال پاؤ گے
بس اک اشارے کی ہے دیر سرخ انقلاب کو
وگرنہ کب کا خاک ہو چکا تھا یہ طلسمِ زر
وگرنہ کب کا آ چکا تھا صبحِ نو کا کارواں
وگرنہ کب کی کٹ چکی تھیں مفلسوں کی بیڑیاں
وگرنہ کب کی چھٹ چکی تھیں ظلم کی یہ بدلیاں
یہ کُل نظامِ زرگری فسوں گری ہے ، ساحرو!
کہ اک اشارے کی ہے دیر سرخ انقلاب کو

معذوری

ماضی و حال سے کچھ ربط نہیں ہے تو نہ ہو
زندگی برسرِ پیکار رہے گی پھر بھی
لاکھ خوش منظر و شاداب پیامات ملیں
زندگی سلسلۂ دار رہے گی پھر بھی

مسکرایا تھا ذرا دیکھ کے تصویرِ جمال
اپنی بے مائگیِ زیست پہ رونا آیا
قربتِ دوست کے سائے میں نہ جانے کیسے!
میں نے شیرازۂ احساس پریشاں پایا

زلفِ جاناں کو تصور نے سنوارا بھی نہ تھا
یک بیک درد کی شب تاب گھٹا پھیل گئی
زندگی ڈھونڈ رہی تھی کوئی عنوانِ حیات
دفعتہً شاہدِ حالات کہیں چیخ اٹھی

رنگِ رخسار و لبِ دوست بہت خوب سہی
تیرگیِ وقت کے ماتھے پہ مسلط ہے ابھی
حُسن اور عشق تقاضائے مشیت ہیں ، مگر
اپنے حالات سے بے بہرہ بھی رہتا ہے کوئی؟

ہم نشیں ! مجھ کو ابھی دعوتِ نظارہ نہ دے
میری دنیا میں تبسم کا ٹھکانا ہی نہیں
میرے کلفت بھرے عالم میں اندھیروں کے سوا
کسی زہرہ ، کسی انجم کا ٹھکانا ہی نہیں

میرے غم خانے میں جب بھی کوئی تارا چمکا
جب بھی لہرائے مرے واسطے رنگیں آنچل

جب کبھی جانِ بہاراں نے پکارا ہے مجھے
چشمِ نم ناک نے رو رو کے بہایا کاجل

ماضی و حال کی تفریق کروں یا نہ کروں
تیرہ بختی بہر عنوان نہیں ٹل سکتی
تیری دوشیزہ نگاہی ، تری پیماں طلبی
اک قدم تلخ حقائق پہ نہیں چل سکتی

میری قسمت ، مرا ماحول تو ہے ناکامی
شعلۂ غربت و افلاس کا جھلسایا ہوا
میرے حالات اجازت نہیں دیتے ہیں مجھے
تجھ سے کس طرح میں کر لوں کوئی پیمانِ وفا؟

میری ہستی کی کشاکش ، مری تلخیِ حیات
بزمِ گیتی کی تمازت سے دہک اٹھی ہے
مضطرب زیست ہے اب اور بھی مجبور و نزار
شدتِ کرب سے پہروں جو لہو روتی ہے

اور روتی ہوئی دنیا میں کوئی وعدۂ دید؟
مضحکہ اپنی محبت کا اُڑانا ہوگا
اِس سسکتے ہوئے ماحول میں تزئینِ شباب؟
ذہنِ بیمار پہ اک زخم لگانا ہوگا

زندگی بیکل و بےخواب رہی ہے اب تک
زندگی برسرِ پیکار رہے گی یوں ہی
زندگی چین سے بیٹھے گی نہ اُس وقت تلک
جب تک اِس عالمِ نادار میں ہے تیرہ شبی

امن کے پھول

اٹھی جو محبسِ کشمیر سے دِلوں کی صدا
دبے ہوئے تھے جو شعلے ، وہ سربلند ہوئے
کسی سے رک نہ سکا سیلِ حق و آزادی
ہر ایک گام پہ دشمن تہِ کمند ہوئے

ہزار دام بچھائے گئے فضاؤں میں
ہزار ظلم کے ساماں ستمگروں نے کیے
مگر وطن کے افق سے طلوع ہو کے رہا
اک آفتابِ یقیں زیست کی امنگ لیے

جو امن امن کے نعرے لگا رہے تھے ، وہی
زمیں پہ جنگ کے شعلوں سے ہمکنار ہوئے
سیالکوٹ میں جو یک بیک در آئے تھے
ہماری جرأتِ پیکار کا شکار ہوئے

بکھر کے رہ گئے سب رام راج کے سپنے
فسونِ کج کلہی اک نظر سے ٹوٹ گیا
غرورِ کثرتِ افواج ایک ہی پل میں
ہمارے عزم کی یلغار سے شکست ہوا

ہر اک محاذ پر دشمن کو سرنگوں کر کے
کسی کی صلح کی خواہش کو کر لیا ہے قبول
بتا دیا ہے یہ دنیا کو آج پھر ہم نے
ہمیں عزیز ہیں سب سے زیادہ امن کے پھول

مشاورت

اے مرے دل نواز نظارو!
کائناتِ الم کے مہ پارو!
اپنے غمِ زندگی کے طوفاں میں
جگمگاتے ہوئے حسین تارو!
عالمِ کیف و کم کے دامن میں
رقص کرتے ہوئے سمن زارو!

ایک تمہیدِ سرگرانیِ شوق
مفلسی کے اتھاہ ساگر میں
اپنی بے مائیگی پہ خنداں ہے

عیش و غم کے مہیب محور میں
چاہتی ہے ، سکوں تلاش کرے
کارزارِ جہاں کے محشر میں

وقت کا کیف بیز پیمانہ
منتظر ہے کہ چشمِ ساقی سے
کچھ اشارے ملیں تو رقص کرے
لب پہ آئے ہنسی تو پھول کھلے
جرأتِ مے کشی کے طوفاں میں
جام چھلکیں تو کوئی بات بنے

لیکن آغاز کی امنگوں سے
چہرہ انجام کا جھلکتا ہے
سیم و زر کا خدائے قہر و غضب
ہر قدم مفلسوں کو تکتا ہے
بےکسوں کی ہر اک تمنا ہے
خونِ کم مائگی چھلکتا ہے

پھر یہی امیدِ صبحِ نو کی کرن
کہہ رہی ہے کہ مسکراتے چلو
اور شبِ غم کی ظلمتوں کے لیے
زندگی کے دیے جلاتے چلو
ماہتابِ یقین اپنا کر
ذرے ذرے کو جگمگاتے چلو

حسن ناصر

ہے زمیں کے ذرے ذرے میں رواں تیرا لہو
تو ہے سورج کی کرن ، محنت کشوں کی آبرو
نام سے تیرے ہے روشن رہ گزارِ انقلاب
سرنگوں ہیں تیرے قاتل اور تو ہے سرخ رو

قلعۂ لاہور سے رہ رہ کے آتی ہے صدا
اے حسن ناصر! حسن ناصر! ابھی زندہ ہے تو
برسرِ پیکار ہے اب بھی تیرا عزمِ جواں
جاوداں ہیں تیرے ولولے کہ پائندہ ہے تو

تو نے قصرِ آمریت کو ہلا کر رکھ دیا
کر دیا مفلوج تو نے پنجۂ ظلم و ستم
مشعلِ راہِ عمل ہے تیرا پیمانِ وفا
تو فروزاں کر گیا ہے شعلۂ احساسِ غم

آج ہم سب عہد کرتے ہیں ، ترے سر کی قسم!
جان کی بازی لگا دیں گے وطن کے واسطے
کھیلنا چاہا کسی نے سامراجی کھیل اگر
ہم سپر بن جائیں گے اپنے چمن کے واسطے

قطعات و رباعیات

حسینؑ ہیں حرفِ صداقت ، حسینؑ حق کی صدا
حسینؑ ہر دلِ دردآشنا کے غم کی دوا
ہر ایک لمحہ یہ کہتی ہے کربلا کی زمیں
حسینؑ محسنِ انسانیت رہیں گے سدا

مظہرِ دینِ رسالت ہیں حسینؑ
باعثِ فخرِ امامت ہیں حسینؑ
کفر کی ہر تیرگی کے واسطے
مشعلِ شمعِ رسالت ہیں حسینؑ

منجمد ہو کے رہ گئے ہم لوگ
ہر کڑی بات سہہ گئے ہم لوگ
ناخدائی پہ ناز کرتے تھے
موجِ طوفاں میں بہہ گئے ہم لوگ

انسانیت کے خواب کی تعبیر ہیں علیؑ
اے نورِ مصطفیٰؐ! تری تنویر ہیں علیؑ
آئینۂ جہاں میں بظاہر ہیں مختلف
لیکن جمالِ دوست کی تصویر ہیں علیؑ

ہم نشین و ہم نفس

تجھ کو بھول بھی چکے
تجھ کو یاد کیا کریں؟
تیری چشمِ ناز سے
دل کو شاد کیا کریں؟

دلوں میں لذتِ سوزِ دروں نہیں ملتی
بدامنِ گل تر جوئے خوں نہیں ملتی
سنا ہے ، فصلِ بہاراں ہے زور پر ، لیکن
چمن نواز نگاہِ جنوں نہیں ملتی

بجھا دو زیست کی رنگین شمعیں
اٹھو ! اِس دل کو اک ٹھوکر لگا دو
تمھیں تو اب سہارا مل گیا ہے
تمھیں کیا ہے ، کسی کا گھر جلا دو

آپ کی بات نہیں ، آپ برا کیوں مانیں
یہ تو مفلس ہیں ، کمینے ہیں ، بَکا کرتے ہیں
آپ کی کار سلامت رہے ! اِن کے سر تو
ایک جھٹکے سے زمیں بوس ہوا کرتے ہیں

دامن میں لرزتے ہوئے تارے ہوں گے
کچھ دیدۂ پُرنم کے اشارے ہوں گے
ہم لوگ ازل سے سہی بیگانۂ غم
سینے میں مگر کچھ تو شرارے ہوں گے

یوں دامنِ گلشن میں صبا گاتی ہے
پایل کے چھناکوں کی صدا آتی ہے
اے چشمِ غزالانِ چمن! دیکھو تو
دوشیزۂ گلزار کدھر جاتی ہے

واماندہ و افسردہ ہے عنوانِ حیات
بجھتے ہوئے تارے ہیں چراغِ دنیا
خوشبو ہے نہ رنگت ہے ، نہ کچھ جوشِ نمو
اک جھلسا ہوا باغ ہے باغِ دنیا

حرفِ اعتراف وانبساط

والدِ مرحوم اصغر مہدی نظمیؔ کے تین شعری مجموعوں پر مشتمل ''کلیاتِ سخن'' کا شائع ہونا میرے لیے ایک عظیم ورثے کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس میں باب میں تھوڑی تگ و دو اور عملی دلچسپی بھی مجھے بڑی گراں مایہ نظر آرہی ہے مجھے فخر ہے کہ میں صاحبِ ''کلیاتِ سخن'' اصغر مہدی نظمیؔ کا بیٹا ہوں جو ایک قابلِ احترام شاعر کی حیثیت سے اپنی زندگی ہی میں اپنی پہچان حاصل کر چکے تھے اور اُن کا ایک وسیع حلقۂ احباب اُن کی شاعری کا معترف اور مداح تھا۔ اِس ''کلیاتِ سخن'' کی اشاعت پذیری میرے خانوادے کے لیے باعثِ عزت وتوقیر ہے۔ وہ ایک عظیم باپ اور ایک عظیم انسان تھے۔ اُن کی تربیت اور دعاؤں کے نتیجے میں میرے بڑے بھائی سید وقار مہدی نے معاشرے میں جو باوقار مقام حاصل کیا ہے، وہ سب پر منکشف ہے۔ میں خدائے بزرگ و برتر کا اِس حوالے سے جس قدر شکر ادا کروں کم ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

______سید خورشید مہدی



اُن کی شاعری میں اگر داخلی عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو دراصل یہ اُن کے دلِ دردمند کا قصور ہے، اُن کے سماجی شعور کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ اپنے عہد کی سچائیوں اور حقیقتوں سے آگاہ بھی رہے ہیں اور اُن سچائیوں کو اُنھوں نے بڑی چابک دستی سے شعری قالب بھی عطا کیا ہے۔ وہ تنظیمی طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے ہوں یا نہ رہے ہوں اُن کی شاعری کے سوتے ترقی پسند تحریک کے سرچشمے سے جڑے ہوئے ہیں اور اُن کے شعری رویوں میں ترقی پسند فکر کی چھاپ واضح ہے۔

مسلم شمیم